تعلیم

اور

تعلیمی ادارے

فہرست مضامین

تعلیم اور تعلیمی ادارے 826

اصلاحِ معاشرہ میں نصاب تعلیم کا کردار 827

کیوبا۔ تعلیم طب اور پاکستانی طلبہ 830

ہم گرمیوں کی چھٹیاں کیسے گزاریں 833

ہمارے علمی تصورات کی خامی اور اس کے نتائج 836

ہمارے تعلیمی مسائل......۱ 840

ہمارے تعلیمی مسائل......۲ 844

ہمارے تعلیمی مسائل اور نئی پالیسی 849

ہماری لائبریریاں کتب بینی اور طلبہ وطالبات 853

جامعہ پشاور کا عظیم اجتماع 858

جامعات، قومی یکجہتی اور پیوٹا کے انتخابات 861

مسلم زبانوں کا عربی حروف تہجی کی طرف واپسی ایک اہم تقاضا 866

پاکستان کے تعلیمی ادارے اور ہمارا مستقبل......۱ 869

پاکستان کے تعلیمی ادارے اور ہمارا مستقبل......۲ 872

پاکستان کے تعلیمی ادارے اور ہمارا مستقبل......۳ 875

پاکستانی جامعات کے ساتھ حکومت کا عجیب رویہ 879

تفہیم دین 883

طلبہ یونین کی بحالی، ممکنات اور خدشات 888

☆......☆......☆

اصلاحِ معاشرہ میں نصاب تعلیم کا کردار

انسانی نفسیات اور سماجیات کے ماہرین اور اطباء و حکماء کے تجربات اور تعلیمات و مشاہدات کے مطابق انسانی عقل و شعور کی نشو و نما چھ مہینے کی عمر سے شروع ہو کر پندرہ سال کی عمر تک مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد لوگوں کی ذہنی نشو و نما میں کوئی خاص بڑھوتری تو نہیں ہوتی لیکن اُن کے اذہان کو پالش اور صیقل کرنے یا اُن میں کوئی تعمیری تبدیلی (change of mindset] کے امکانات ضرور ہوتے ہیں۔ اِسی بناء پر دانا اقوام کے ماہرین سماجیات و عمرانیات ایک اچھی قوم کی تشکیل اور پروان چڑھانے کیلئے مذکورہ بالا عمر کے افراد پر محنت کی تلقین و ہدایت کرتے ہیں۔ یہ بات تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ معاشرہ افراد اور خاندانوں اور قوم کے مجموعے سے بنتا ہے۔ لہٰذا کسی صالح معاشرہ کے ارتقاء میں فرد کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اگر فرد کی اصلاح کا بندوبست اور انتظام منظّم انداز میں کا جائے تو ظاہر بات ہے کہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آئیگا۔ فرد کی اصلاح میں جن اداروں کا بہت اہم اور بنیادی کردار ہوتا ہے۔ اُن میں سے پہلا کردار فرد کے والدین اور خاندان کا ہوتا ہے۔ وہ خاندان جس میں بچہ پیدا ہوتا ہے اور بچے کا جن لوگوں سے ابتدائی واسطہ پڑتا ہے اِن میں اُس کے والدین، بہن بھائی اور وہ عزیز و رشتہ دار ہیں جو اِس خاندان کے ساتھ تعلقات رکھتے ہیں۔ اگر خاندان کے یہ لوگ اپنے قول و فعل سے اسلامی اخلاقیات کا نمونہ پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں لیکن اگر بچہ گھر میں اپنے ماں باپ کو آپس میں لڑتے جھگڑتے، تُو تُو، میں میں، میں مبتلا دیکھتا ہے والدین بچے کے سامنے جھوٹ، باپ گھر میں موجود ہے اور گھنٹی بجنے پر بچے کو کہہ کر بھیجتے ہیں کہ دروازے پر کھڑے شخص سے کہو کہ ابّا گھر پر نہیں تو لازماً بچہ بھی کل اپنے گھر آئے ملاقاتیوں سے بھی یہی کہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تربیت اولاد کے سلسلے میں سب سے پہلی اور بڑی ذمہ داری والدین پر عائد ہوتی ہے۔ والدین کو اِس اہم اور بھاری ذمہ داری کی ادائیگی کی وجہ سے ہی اللہ تعالیٰ نے اتنا اعلیٰ مقام دیا ہے کہ اولاد کا اُن کے سامنے ''اُف'' تک کرنا منع قرار دیا گیا ہے، والدین اولاد کی تربیت اُس صورت میں بہترین طور پر کر سکتے ہیں جب خود اُن کا اپنا عمل بھی اسلامی اقدار کا پاسدار ہو۔

اسلام میں تربیت اولاد کا اتنا خیال رکھا گیا ہے کہ پیدائش کے ساتھ ہی بچے کے کان میں اذان دی جاتی

ہے تا کہ بچے کی سماعت میں جو پہلے کلمات پڑیں وہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی پر مبنی ہوں، اِس کے بعد اچھے نام کی تلاش ہوتی ہے۔ بچے کے حوالے سے اِن دونوں باتوں کی ہدایت جنابِ رسول ﷺ نے فرمائی ہے۔اس کے بعد جب وہ زبان کھولنے کے قابل ہو تو اسلامی کلمات سے اُس کا آغاز کیا جائے اور بتدریج اس کو دیگر اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیمات سے بھی آگاہ کیا جاتا رہے۔اولاد کی تربیت میں ماں کا کردار سب پر غالب ہے۔وہ مائیں جن کی زبان سے بچے اسلام واخلاق کی لوری سنتے ہیں اپنے بچوں کے کردار کی نہایت مضبوط بنیاد استوار کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور جن کے بچے آنکھ کھولنے کے ساتھ ہی ڈھولکی کی تھاپ اور سارنگی اور طبلے کی آوازیں سنتے ہیں اُن کو بعد کی زندگی میں طرح طرح کی خرافات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

فرد کی کردار سازی میں ماحول اور معاشرہ جس میں ایک فرد زندگی کے شب وروز گزارتا ہے بہت اہم کردار ادا کرتا ہے۔خاندان، گھر، محلّہ اور قریہ وبستی کے لوگ جس طرزِ حیات، تہذیب اور رسوم ورواج کے پیروکار ہوتے ہیں، بچہ بھی اُسی کے پیروکار ہوتے ہے۔ اِس طرح معاشرے کی سوچ بچے کی سوچ اور معاشرے کا عمل بچے کا عمل بن جاتا ہے۔

ریاست کے پاس اسلامی اقدار واخلاقیات پر مبنی ماحول پیدا کرنے کے دو مؤثر ترین ذرائع ہیں جن کے ذریعے اسلامی اخلاق کی مضبوط عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے۔ان میں سے ایک بامقصد تعلیم اور دوسرا مؤثر قانون ہے۔

دُنیا کے سارے مصلحین، واعظین اور ماہرین سماجیات وعمرانیات اسی بات پر متفق ہیں کہ تعلیم انتہائی مؤثر ذریعہ تربیت ہے۔ بچہ ابتدائی عمر سے جوان ہونے تک تعلیم عمل ومراحل سے گزرتا ہے۔مندرجہ ذیل نکات کا خیال رکھنا لازمی ہے۔

۱۔اسلام کے بنیادی عقائد اور ارکان متنازعہ اور مسلکی موشگافیوں سے ہٹ کر قرآن وحدیث کی روشنی میں پڑھائے جائیں تا کہ نوجوان نسل ایک معتدل، روشن خیال اور مخلص مسلمان کی صورت میں ملک وقوم کے کام آسکے۔

۲۔دُنیا میں رائج سائنس وٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ ترین علوم کو نصاب میں شامل کیا جائے تا کہ آئندہ نسلیں معاشی اور دفاعی طور پر ایک مضبوط اور خود دار قوم بن کر اُبھرے اور دیگر ممالک کی مالی امداد کیلئے راہ نہ دیکھیں

اور اپنے بجٹ اور ٹیکسوں میں دوسروں کی محتاج نہ ہو۔

۳۔ ملکی سطح پر کونے کونے میں ایک ہی نصاب تعلیم رائج کیا جائے تاکہ گاؤں دیہات سے لیکر بڑے بڑے شہروں تک اور ایک دیہاتی سے لیکر جاگیردار، سیاستدان اور جرنیل تک سب کے بچے ایک ہی طرز نصاب اور ادارے میں تعلیم حاصل کر کے قومی یکجہتی کیلئے بھائی بھائی بن کر اسی سطح پر آگے بڑھیں تاکہ قوم کے بچوں میں کسی قسم کی اونچ نیچ، چھوت چھات اور احساس کمتری و برتری نہ ہو،

ریاست کے پاس دوسرا ہتھیار قانون ہے۔ قانون ایک منفی طاقت ہے جو صرف خرابی سے روکنے کیلئے بریک کا کام دیتا ہے اور اِس کے ہوتے ہوئے بے راہ روی کی روش فروغ نہیں پاتی۔ ۔

☆......☆......☆

کیوبا- تعلیم طب اور پاکستانی طلبہ

اس بات میں شک نہیں کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے ساتھ بعض معاملات کے نبھانے کے طریقۂ کار کے ساتھ اختلافات کے باوجود مختصر وقت میں تعلیمی میدان میں بہت بڑے بڑے کاموں کے لئے سنگ ہائے میل رکھنے میں کامیاب رہا ہے۔ جامعات کی سطح پر پی ایچ ڈی اور پوسٹ ڈاک کے لئے قابل قدر وظائف کا حصول اتنا آسان کبھی نہ تھا جتنا محترم پروفیسر ڈاکٹر عطاؤالرحمان صاحب کی قیادت میں ہیک (HEC) نے آسان بنالیا ہے۔

میں پروفیشنل اور مستند و مسلمہ کالم نگار نہیں ہوں اور میری کالم نگاری کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے ہیں لیکن الحمدللہ! کہ پاکستانی بہن بھائیوں کے ساتھ اسلام اور پاکستان کی بنیاد پر جو درد، خلوص اور سادگی پر مبنی تعلق موجود ہے شاید اسی کی بناء پر لوگوں نے ہم جیسے نوآموز کالم نگاروں کو ان معروف، مستند کالم نگاروں میں شمار کیا ہے جن کے پاس لوگ اپنے مسائل لکھ کر بھیجتے ہیں اور وہ بعض اوقات لوگوں کے مسائل اپنے کالم میں بیان کر کے حکومت کے سامنے لاتے ہیں اور بعض حکومت کے کارپردازوں کے ساتھ ذاتی تعلقات کی بناء ذاتی رسائی کے ذریعے حل بھی کرلیتے ہیں۔

میں اپنے بہن اور بھائیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جو مجھ جیسے بے بس، بے بضاعت اور احقر کے پاس اپنے مسائل خطوط اور ای میلز وغیرہ کے ذریعے بھیجتے ہیں بہت کھلے دل کے ساتھ صاف الفاظ میں عرض کرنا چاہوں گا کہ میں ایک ادنی پروفیسر کی حیثیت سے تو ''سارے جہاں کا غم ہمارے جگر میں ہے'' کے مصداق امت مسلمہ کے ہر ہر فرد کے دکھ درد کا احساس دل میں چھپائے بیٹھا ہوں لیکن ان کے مسائل کے حل کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا اور متعلقہ افراد کو نبی ﷺ کی تعلیمات کی پیروی کے ذریعے اپنے سارے مسائل کے حل کا نسخہ تجویز کرنے کے سوا شاید کچھ زیادہ کر گزرنے کی حالت وحیثیت نہیں رکھتا۔

البتہ جہاں تک حکومتِ وقت کا تعلق ہے ان کے سامنے اپنے کالم کے ذریعے ان سطور میں اپنے بھائی بہنوں کے بعض مسائل اگر فقیرانہ صدا کے ذریعے سامنے لانے میں کامیاب ہوسکا اور حکومت نے کمال مہربانی سے ان پر ہمدردانہ غور کے ذریعے کسی بھائی بہن کو مدد اور ریلیف پہنچائی تو ہمارے لئے اس سے زیادہ خوشی اور

کیا ہوگی؟

یہ لمبی چوڑی تمہید میں نے اس لئے باندھی ہے کہ یہ پہلی دفعہ ہے کہ مجھے اپنے کالم کے جواب میں موصولہ دو ای میلز میں نوجوان نسل کے دو اہم مسائل کے بارے میں حکومت کی توجہ مبذول کرانے کا حکم ملا ہے۔

مجھے ایک ادنیٰ استاد کی حیثیت سے اپنے طلبہ کے ساتھ بہت عقیدت اس لئے ہے کہ انہی نوجوانوں پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ لہٰذا اس وقت ایک اہم مسئلہ ہمارے ان نوجوانوں کا ہے جو میڈیکل کی تعلیم کے حصول کے لئے ہائر ایجوکیشن کے پروگرام کے ذریعے کیوبا جانے کے لئے سارے ضروری مراحل طے کر کے اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ ہمیں آج یا کل اطلاع ملے گی کہ پرواز کے لئے تیار ہو جاؤ۔ لیکن یہ ''آج اور کل'' ہفتوں اور مہینوں میں تبدیل ہوتے ہوئے طلبہ، والدین اور ان کے یار دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے ایک عجیب بے چینی، تکلیف اور سب سے بڑھ کر طلبہ کا گومگو کی حالت میں رہنے کی وجہ سے ان کے تعلیمی سال اور کیریئر کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو چکا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ غیر ممالک میں تعلیم کے حصول کے لئے جانے سے پہلے بہت سارے امور کو نمٹانا ضروری ہوتا ہے اور بعض اوقات نا دیدہ اور غیر متوقع پیش آمدہ حالات کی وجہ سے بھی طے شدہ پروگرام میں تاخیر و تبدل وغیرہ آ جاتا ہے لیکن اس پروگرام کے منتظمین کو یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ انتظار کے لمحات اور ایسے انتظار کے لمحات کہ جن کے ساتھ پورا خاندان وابستہ ہوتا ہے، بہت اذیت ناک بن جاتے ہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ ہمارے معاشرتی روایات واقدار کے تحت ان طلبہ کو ان کے رشتہ داروں، یار دوستوں نے الوداعی کھانے تحفے تحائف اور دعاؤں کے ساتھ اپنی دانست الوداع کہا ہوگا لیکن ہفتہ دو ہفتہ کے بعد جب ان کو پتہ چلا ہوگا کہ برخوردار ابھی تک ادھر ہی ہیں تو اس کے والدین کو وہ کہانی معلوم نہیں کتنے لوگوں کو کتنی بار دہرانی پڑی ہوگی۔

مجھے یقین ہے کہ کسی فنی و تکنیکی سبب سے یہ تاخیر واقع ہو رہی ہوگی اور شاید چند دن پہلے میڈیا کے ذریعے اس حوالے سے یہ خبر بھی آئی تھی کہ پی ایم ڈی سی نے کیوبا کی طبی ڈگری کے حوالے سے اپنے چند تحفظات کی وضاحت کے لئے کیوبا کے سفیر سے ملاقات بھی کی تھی، وہ تو جو کچھ ہوگا، قانون و حقائق کے مطابق حل کیا جانا چاہئے لیکن اس دوران اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ہمارے طلبہ کا تعلیمی سال ضائع نہ ہونے

پائے اوران کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھا جائے تاکہ ان کواوران کے والدین کوتسلی واطمینان حاصل ہو۔

ہم کیوبا کے شکر گزار ہیں کہ وہ ہمارے طلبہ کوطب کے اہم شعبے میں مدد فراہم کرنے کے لئے پیش کش کئے ہوئے ہیں۔لیکن حکومت کا فرض ہے کہ اپنے نونہالوں کے عقائداوراخلاقیات کی حفاظت کے بندوبست کے ساتھ اس بات کا بھی اہتمام کرے کہ وہاں سے حاصل ہونے والی ڈگری صرف ڈگری نہ ہو بلکہ اس ڈگری کے تحت حاصل طبی مہارت اگر پاکستان میں حاصل ہونے والی مہارت سے ایک ذرہ زیادہ نہ ہوتو کم کسی صورت بھی نہیں ہونا چاہیئے۔

دوسرا مسئلہ ہمارے ان نوجوانوں کا ہے جنہوں نے ایم اے کی ڈگریاں حاصل کی ہیں اور گذشتہ حکومت کا ایک اچھا کام یہ تھا کہ ماسٹر ڈگری ہولڈرز کوانٹرن شپ کے ذریعے مبلغ دس ہزار روپے کا وظیفہ ایک سال کے لئے ملنے لگا تھا۔ یہ ایک اچھا پروگرام تھا کیونکہ اس کے ذریعے ایک طرف بیروزگاری میں کمی آنے کا امکان تھا اور دوسری طرف ماسٹر ڈگری ہولڈرز کو پروگرام کے اختتام پر جاب تلاش کرنے کے لئے کچھ تجربہ بھی حاصل ہوجاتا تھا۔اب شاید موجودہ حکومت نے اس پروگرام کو وائنڈاپ کرنے کا کوئی پروگرام بنایا ہے۔اگرایسا ہے تو تعلیم یافتہ نوجوانوں میں اس سے ایک قسم کی مایوسی پیدا ہوگی۔لہٰذا اس پروگرام کو جاری رکھنے میں افراداور معاشرے کی بھلائی کے ساتھ ملک وقوم کی بھلائی کا امکان بھی پیدا ہوسکتا ہے۔

اب توکہیں ہمارے بھی ہاں یہ اصول پارلیمنٹ کے ذریعے بن جانا چاہئے کہ گذشتہ حکومتوں کے کم ازکم اچھے کام جاری رکھنا لازمی ہو۔

ہمارے ہاں ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک طرف تعلیم یافتہ لوگ بے روزگار پھر رہے ہیں اور دوسری طرف چند افریقی ممالک کو چھوڑ کر ہم سب سے کم شرح تعلیم والے ملکوں میں شمار ہیں۔ ماسٹرز بے روزگاروں کے ذریعے قوم کے بچوں کو کم ازکم مڈل سطح تک تعلیم ہنگامی بنیادوں پر دینے سے تعلیمی میدان میں ایک انقلاب برپا ہوسکتا ہے۔ نبی ﷺ نے توغزوۂ بدر کے کافر قیدیوں سے بھی قوم کے بچوں کوتعلیم دلانے کا کام لیا تھااور ایک ہم ہیں کہ..........۔

☆......☆......☆

ہم گرمیوں کی چھٹیاں کیسے گزاریں

عزیز نونہالانِ وطن! ایک دفعہ پھر جون کا مہینہ قریب آرہا ہے اور یقیناً بہت سارے بچوں کے دل و دماغ گرمیوں کی چھٹیوں کا تصور اور خاکہ تشکیل پارہا ہوگا اور دلچسپ علمی، معاشرتی، سماجی اور سیر تفریح اور کھیل کود منصوبے پروان چڑھ رہے ہوں گے۔ وہ بچے مبارکباد کے مستحق ہیں جن کے اذہان میں سر گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کا کوئی نہ کوئی منصوبہ زیر غور ہے۔ کیونکہ اسلام ہمیں ہر کام کیلئے نظم وضبط اور قرینہ وسلیقہ سیکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اِن سطور کے ذریعے میں آپ لوگوں کے ساتھ اپنے بچپن کو آواز دیتے ہوئے اپنے زمانے میں گرمیوں کی چھٹیوں کے بارے میں کچھ بتاؤں گا اور چند تجاویز آج کے حوالے سے بھی آپ لوگوں کے سامنے رکھنا چاہوں گا۔

؎ شاید کہ اُتر جائے تیرے دل میں میری بات

ہمارے زمانے کی پہلی بات یہ ہے کہ گرمیوں کی چھُٹیوں سے ایک ہفتہ پہلے ہمارے اساتذۂ کرام ہم سب کو باقاعدہ طور پر چھٹیوں کا کام لکھوا کر اُسے مکمل کرنے کی تاکید کرتے۔ پھر چھٹیوں کے بعد اساتذۂ کرام اُسے باقاعدہ چیک کر کے کاپیوں پر دستخط بھی کرتے تھے۔ اِس طرح ہر لڑکا گرمیوں کی چھٹیوں کا کام اساتذہ کے خوف سے ضرور مکمل کر کے ہی چھوڑتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں یقیناً طلبہ وطالبات کا معمول بدل جاتا ہے لیکن مسلمان بچوں کا یہ روٹین ناقابل تغیر ہے کہ علی الصباح (Early in the morning) اُٹھنا ذمہ دار طلبہ کی اولین پہچان ہے۔ جو طلبہ اِس لائحہ عمل پر عمل کرتے ہیں اُن سے یقیناً صبح کی نماز قضا نہیں ہوتی لیکن جو طلبہ چھٹیوں کو ضروری کاموں سے بھی چھُٹی سمجھ کر سورج طلوع ہونے کے بہت دیر تک بستروں پر پڑے رہتے ہیں وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ رحمتوں اور صبح کی برکتوں سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ اُن کے پورے دن کا شیڈول بکھر کر رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ہماری مائیں اِس کا بہت اہتمام کرتی تھیں اور ہمیں سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی بیدار کر کے نماز پڑھنے کی تلقین کرتیں۔ صبح اُٹھنے کے بعد اگر ممکن ہو اور آپ لوگوں کے گھروں کے قریب کوئی پارک وغیرہ ہو تو کم از کم آدھ گھنٹہ چہل قدمی آپ کو دِن بھر کیلئے تروتازہ رکھنے مین بہت مددگار ثابت ہوگی۔ اگر یہ نہ ہوسکے تو گھر ہی میں ہلکی پھلکی ورزش بھی کرنا ضروری ہے۔

ہمارا ماحول چونکہ دیہاتی تھا لہٰذا صبح روکھی سوکھی روٹی چائے کے ساتھ بطور ناشتہ لینے کے بعد اکثر مال مویشی

چرانے کیلئے قریبی کھیتوں وغیرہ میں لے جاتے اور ساتھ کتاب اور کاپی لے جا کر گرمیوں کا کام بھی کرتے۔ دھوپ تیز ہونے سے پہلے گھروں کو واپس آ کر دوپہر کا کھانا کھا کر سو جاتے۔ جبکہ اکثر لڑکے والدین کو سوتا دیکھ کر دبے پاؤں گھروں سے نکل کر غلیلوں کے ذریعے پرندوں کو شکار کرتے اور نہروں اور بارانی جوہڑوں میں نہاتے۔ بعض بچے پرندوں کے گھونسلوں سے اُنکے چھوٹے چھوٹے چوزے اُتارتے جو اکثر اُن کے ہاتھوں میں مرجاتے۔ اس قسم کی سرگرمیاں طلبہ کیلئے کسی طرح بھی جائز و موزوں قرار نہیں دی جاسکتیں۔ ایک تو اِس طرح وقت ضائع ہوتا ہے دوسرا صحت کیلئے یہ سرگرمیاں بہت مضر ہوتی ہیں۔

یاد رکھیں! کہ تیرا کی سیکھے بغیر کبھی پانی میں نہ اُتریں اور آج کل نہروں اور جوہڑوں میں نہانا ہزار بیماریوں کو دعوت دینا ہے۔ پرندوں کے گھونسلوں میں بعض اوقات سنڈی پیڈ نامی بہت زہریلا جانور بھی پایا جاتا ہے جو پرندوں کے انڈے وغیرہ کھانے کیلئے گھونسلوں میں پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اِس قسم کے کاموں سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہیے۔ ویسے بھی اسلام میں چھوٹے چوزوں کو اُن کے والدین پرندوں سے جدا کرنا سخت منع ہے۔

پیارے بچو! آپ لوگوں کا زمانہ تو مقابلے (Competition) کا زمانہ ہے۔ آج آپ کا مقابلہ صرف اپنے سکول، ضلع یا صوبے کے طلبہ کے ساتھ نہیں ہے بلکہ اب چونکہ پوری دُنیا ایک گاؤں کی صورت اختیار کر چکی ہے لہٰذا پاکستانی بچوں کا مقابلہ پوری دُنیا کے بچوں کے ساتھ ہے۔ اِس عالمی گاؤں میں باوقار جگہ بنانے اور عزت کی زندگی گزارنے کیلئے طلبہ زندگی کے ہر میدان میں سخت محنت کرنا ہوگی۔ گرمیوں کی چھٹیوں کا مطلب صرف چھٹیاں منانا نہیں ہے بلکہ یہ چھٹیاں بچوں کو موسم کی سختی سے محفوظ کرنے کیلئے کی جاتی ہیں کیونکہ جون جولائی میں سخت گرمیاں ہوتی ہیں۔ لہٰذا گرمیوں میں چلنے پھرنے سے پھول جیسے بچوں کو لُو لگنے سے کئی قسم کی بیماریوں کے لگنے کے خدشات ہوتے ہیں۔ اِس لئے حکومت اپنے مستقبل کے معماروں کی حفاظت کی خاطر چھٹیاں دے دیتی ہے لیکن اِس کے ساتھ ہی گھروں میں یا دوپہروں کو گھنے سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھ یا مری، سوات اور چترال جیسے صحت افزاء مقامات پر جا کر سکولوں میں کیئے گئے کام کو سمجھ کرنا اور چھٹیوں کے بعد آنے والے امتحان کیلئے اپنے آپ کو تیار کرنا اِن چھٹیوں کا اہم مقصد ہے۔ اِس لئے ضروری ہے کہ اِن چھٹیوں میں ہمیشہ تعلیمی سرگرمیوں اور صحت کے اصولوں کا خیال رکھنا طلبہ کا اولین فریضہ ہے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں سکول میں دیا گیا علمی کام مکمل کرنے کے ساتھ ایک اہم کام طلبہ کے کرنے کا یہ ہے کہ جن طلبہ نے ابھی قرآن پاک ناظرہ مکمل نہیں کیا ہے اور اِس کی وجہ سے وہ کھل کر تلاوتِ کلام پاک کی برکتوں سے محروم ہیں۔ اُن کے والدین پر فرض ہے کہ اپنے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کیلئے اپنی پہلی فرصت میں کسی اچھے قاری صاحب کا

انتظام کروائیں یا اپنی اپنی مسجدوں میں موجود امام صاحب کی خدمات حاصل کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہمارے یہی بچے اِس دُنیا سے جانے کے بعد ہمارے لئے اُس صورت میں صدقہ جاریہ ہوں گے کہ اُن کی دینی تربیت ہوئی ہو۔

اِن چھٹیوں میں نصابی کتب کے علاوہ کم از کم دو چار ایسی کتب کا مطالعہ بھی ضروری ہے جو آپ کے علم میں اضافے کا سبب بن سکے۔ اِس سلسلے میں کوئی سی ایک کتاب "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلّم" کی ضرور ہونی چاہئے۔ جنرل نالج کے مطالعہ کیلئے روزانہ اخبار کا مطالعہ بھی اپنی معمولات کا ضروری حصّہ بنانا چاہیے۔

والدین کا ہاتھ بٹانا، اپنے سے چھوٹے طلبہ کے ساتھ اُن کی تعلیمی سرگرمیوں میں مدد کرنا اپنے محلے کے دس چھوٹے بچوں کو سو[۱۰۰] تک ہندسے اور الف تا ی ے تک حروف سکھانا بہت بڑا کام ہے۔

اپنے ہم جماعت ساتھیوں کے ساتھ مِل کر اپنے محلے کی مسجد کی صفائی ستھرائی اور مرمت میں حصّہ لینا، اپنی گلیوں کو صاف رکھنے کا شعور پیدا کرنے کیلئے کوئی مہم چلانا بھی اِن چھٹیوں کا لازمی حصّہ ہونا چاہیے۔

کچھ وقت نکال کر اپنے گاؤں محلے کے حجرے میں بزرگوں کے ساتھ بیٹھ کر اُن سے اُن کے وقتوں کی باتیں سننا بھی علم میں اضافے کا سبب بن سکتا ہے۔ اِس طرح ہر طالب علم روزانہ کی بنیاد پر رات کو سونے سے پہلے اس بات کا تجزیہ کرے کہ آج میں نے تعلیم کے حصول، نیکی کے کام، والدین اور بزرگوں کی اطاعت اور مدد اور ہم عمر دوستوں کے ساتھ تعاون کے سلسلے میں کتنا کام کیا ہے۔ اگر آج کوئی کمی رہی ہے تو اگلے دِن اِس کمی کو رفع کرنا چاہیے۔ اِس طرح گرمیوں کی یہ چھٹیاں تعمیری سرگرمیوں میں گزر کر ہر طالب علم ملک وقوم کیلئے ایک تعمیری کردار ادا کرنے کیلئے اپنی تیاری کے مراحل طے کرتا ہے۔

ہاں! یہ بات تو میں بھول ہی گیا کہ اِن چھٹیوں میں ہفتہ دس دن کیلئے کسی صحت افزا یا تاریخی مقام کی سیر کرنے کیلئے ضرور جائیں کہ یہ بھی علمی سرگرمیوں کا ایک لازمی حصہ تصور ہوتا ہے۔

پیارے بچو! اللہ سے دُعا ہے کہ ہم سب کی یہ چھٹیاں آرام، سکون اور تعمیری و بامقصد سرگرمیوں میں گزریں اور مملکتِ خداداد پاکستان کو اللہ تعالیٰ امن سلامتی اور خوشیوں کا گہوارہ بنادے کہ ہم اور آپ اور سارے پاکستانی اس میں تا ابد خوشحال اور سلامت رہیں۔ یقیناً آپ مجھے اور میں آپ کو دعاؤں میں یاد رکھوں گا۔

فی آمان اللہ۔ چھٹیاں بخیر و عافیت۔

☆......☆......☆

ہمارے علمی تصورات کی خامی اور اُس کے نتائج

علم عربی زبان کا لفظ ہے اور اِس کے عام فہم معنی ہیں، جاننا، غور وفکر کرنا وغیرہ اِس کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے علم کے تفوق، فضیلت اور حکمرانی کیلئے اِس کی ضرورت کا اندازہ اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت آدمؑ کیلئے ملائکہ کی طرف سے سجدۂ تعظیمی میں جو اہم فضیلت بیان ہوئی وہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کو ساری [ضروری] چیزوں کے نام سکھائے گئے تھے۔ یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر عرض کردوں کہ چیزوں اور اشیاء کے نام سیکھنا بہت بڑا علم ہے۔ اِس لئے کہ کسی چیز کا نام سیکھنے کے بعد اُس کی دیگر کیفیات، خصوصیات اور کیمسٹری وغیرہ کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ جدید سائنس کی بنیادوں میں اشیاء کے ناموں کے علم کا بہت بڑا کردار ہے۔

قرآن وحدیث میں علم کی تقسیم نہیں کی گئی بلکہ علم کو مطلقاً علم کہا گیا ہے۔ یہ دنیوی اور اخروی یا سائنسی و مذہبی علوم کی تقسیم بہت بعد کی بات ہے اور یہ مسلمانوں کے ہاں غلط طور پر در آئی ہے اور اِس تصورِ علم نے کہ یہ دینی علم ہے اور یہ دُنیوی علم ہے، مسلمانوں کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

اِن سطور میں علم کی اہمیت وفضیلت پر براہ راست بات نہیں کی جا رہی اِس لئے کہ آج اِس کے باوجود کہ ہم اِس پر عمل نہیں کرتے کہ دُنیا میں بقاء اور سرخروئی کیلئے علم کا حصول بہت ضروری ہے، پھر بھی ان پڑھ سے ان پڑھ آدمی اس کی افادیت اور اہمیت سے اگاہ ہے۔ اس لئے ان پڑھ بھی اپنے بچے کو تعلیم کے حصول کی طرف راغب کرنے کیلئے کہتا ہے کہ پڑھو ورنہ پھر میری طرح اندھے رہو گے۔ یہاں اِس بات کا ذکر بھی شاید ضروری ہے کہ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں تعلیم یافتہ اور ان پڑھ کی مثال بینا اور اندھے آدمی سے دی گئی ہے۔

قرآن کریم میں اسلام کی ابتداء کیلئے جو آیت شریفہ نازل ہوئی وہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کو معلوم ہے۔
اِقراءُ باسمِ ربك الذی خلق ترجمہ: پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

یہ وہ آیت شریفہ ہے جو شاید سارے اسلامی ممالک کے مدارس، تعلیمی اداروں، گھروں اور دفاتر میں تلاوت ہوتی ہے اور ہوتی رہیگی، لیکن افسوس کا مقام ہے کہ اِس انقلاب انگیز پیغام کے باوجود دُنیا میں "ان پڑھوں" کی تعداد اسلامی ممالک میں سب سے زیادہ ہے۔ اِس آیت میں جہاں ہر انسان کیلئے بالعموم اور ہر مسلمان کیلئے بالخصوص حصول تعلیم کا حکم ہے وہاں پہلی دفعہ بہت لطیف انداز میں یہ پیغام بھی موجود ہے کہ علم،

مطلقاً علم ہے اِس میں دینی و دُنیاوی کی کوئی تقسیم نہیں ہے لہٰذا ہر انسان کیلئے حکم ہے کہ وہ پڑھے۔ البتہ ہر انسان کوئی بھی چیز پڑھتے اور سیکھتے وقت یہ یاد رکھے کہ جو کچھ بھی پڑھنا اور سیکھنا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات کے اِسم مبارک کے ساتھ کہ وہ رَبّ [پالنے والا] ہے، شروع کریں، پھر آگے اِسی میں ایک اور پیغام ہے اور وہ یہ کہ وہ رَبّ جس کا نام لیکر پڑھنے اور سیکھنے کا عمل شروع ہوتا ہے، بہت ساری صفات کا مالک ہے اور اُن بے شمار صفات میں سے ایک بڑی صفت "خالق" کی ہے۔ خالق پیدا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ صفت پہلی دفعہ خاتم النبیینؐ کے ذریعے انسانیت کے سامنے قیامت تک کیلئے ظاہر فرمائی جس میں پڑھنے لکھنے اور سیکھنے کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ خالق کی صفتِ خالقیت سے انسان کو جو حصہّ ملا ہے، اُس کو بروئے کار لا کر اِس دُنیا کو عملی طور اللہ کی صفات سے بھر دیا جائے۔ اللہ کی صفات میں صفت خالقیت اور صفت عدل کا دُنیا میں انسان کی بقاء کے ساتھ بہت گہرا تعلق ہے۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی صفاتِ کریمہ میں سے تقریباً ہر صفت کی ایک جھلک ضرور دی ہے اور اِن صفات سے سب سے زیادہ متصف انبیاء علیھم السلام ہوتے ہیں۔ انبیاء علیھم السلام میں سے خاتم النبیینؐ سب سے زیادہ رحمانی صفات کے مالک تھے۔ اُس کے بعد صحابہ کرامؓ اور اولیاء اللہ اور دیگر بزرگان دین و صلحاءِ امت اِس میں شامل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ کائنات اور انسان کیلئے سب سے زیادہ انبیاء علیھم السلام اور اُن کے نقش قدم پر چلنے والے حضرات ہی مفید رہے ہیں۔ آج بھی خاتم النبیینؐ کی سنتِ مبارکہ پر چلنے والے لوگ ہی دُنیا کیلئے مفید و تعمیری سوچ و فکر و عمل کے حامل ہو سکتے ہیں، لیکن اُمتِ مسلمہ میں مسئلہ یہ ہوا کہ ہم نے دین و دُنیا میں تفریق کر کے علوم کو انہی دو خانوں میں بانٹ دیا۔

چنگیز و ہلاکو کی اسلامی ممالک و خطوں میں تباہی و بربادی کے بعد امتِ مسلمہ جن مراحل سے گزری اُس میں ترک دُنیا کا رحجان بہت غالب ہوا اور ہمارے ہاں تزکیہ نفس کے حقیقی اور مطلوب تصوف کی بجائے ترک دُنیا کو زہد و تقویٰ کا معیار سمجھا گیا جس نے امت کے شرشہ دماغوں کو رھبانیت کی راہ پر ڈال دیا، اس کے علاوہ ہمارے ہاں کی ملوکیت نے بہت بڑا ستم ڈھایا۔ بادشاہوں اور شہنشاہوں نے اپنی اپنی سلطنتوں میں امت کے بہترین سائنسدانوں، دانشوروں، اطباؤں اور حکیموں کو ایجادات و انکشافات کو آگے بڑھانے کی بجائے ایسے اکسیری نسخوں کی دریافت پر لگا یا جس سے "بادشاہ سلامت" ہمیشہ جوان رہے اور زندہ رہے۔

یہیں سے مسلمانوں کے ہاں دینی اور دُنیاوی علوم کی تقسیم ایسی راسخ ہوئی کہ اب جان ہی نہیں چھوڑتی۔ جس کے نتیجے میں آج ایک ارب مسلمانوں کے ہاں مغرب کے مقابلے کا کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جہاں وقت اور عصر کے تقاضوں کے مطابق علوم کو آگے بڑھایا جاسکے۔

ہمارے ہاں مسٹر اور مولوی، انگریزی اور عربی۔ اردو کی بحث آج بھی اتنی ہی لاینحل ہے جتنی آج سے سو برس پہلے تھی۔ جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے یہ آیا ہے کہ قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے دُنیاوی امور منظّم نہ کرسکے، اور بدیہی طور پر ہم دُنیا کے امور چلانے اور دُنیا کو ہدایات (Directives) دینے کے منصب سے معزول ہوگئے۔ اِس کے برعکس مغربی اقوام نے سپین میں مسلمان علماء ہی سے علوم کے حصول اور استعمال کا گر سیکھا اور اپنے ہاں مضبوط بنیادوں پر اُسے استوار کر کے آج کا چکا چوند مغرب دُنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اِس بات میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ دُنیاوی لحاظ سے آج امریکہ اور مغرب جس مقام پر ہے شاید آج تک اِس سے زیادہ ترقی اور انتظام وانصرام انسانی فکر وسوچ سے ماوراء ہو۔ لیکن یہاں بھی افسوس کا مقام یہ ہے کہ مغرب نے حواس خمسہ کی بنیادوں دُنیا کو زیر کرنے میں تو ایک حد تک کامیابی حاصل کر لی لیکن تزکیہ نفس کے حوالے سے وہاں انسان اتنا پیچھے رہ گیا کہ وہ اپنی تخلیق کا مقصد بھول ایسی بھول بھلیوں میں کھو گیا کہ ہم جنس پرستی کی قانونی اجازت دیکر جانوروں کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ یہاں گویا جو تقسیم دینی ودنیاوی علوم کے حوالے سے مسلمانوں میں رائج ہے وہ تقسیم عالمی سطح پر بھی مغربی اور مسلم دُنیا کے درمیان زیادہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ موجود ہے، جس کا نتیجہ معاشروں کے درمیان تصادم اور کشمکش کی صورت میں نکل رہا ہے اور انسان کی تخلیق کا جو لابدی (Altimate) مقصد تھا وہ آج بھی تشنہ تکمیل ہے۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے اقراء کا حکم دیکر فرمایا کہ علم حاصل کر اُس رب کے نام پر جس نے "خلق" کا کارنامہ سرانجام دیا۔ اب انسان کا فرض ہے کہ وہ علم حاصل کر کے اللہ کی صفت خالقیت سے جو انسان میں اللہ نے رکھی ہے، فائدہ اُٹھاتے ہوئے تعمیر سیرت اور تعمیر دُنیا کا اہم فریضہ سرانجام دے۔ عالم یا تعلیم یافتہ شخص کی پہچان اب یہ ہونی چاہیئے کہ خلق کے مرحلے گزرنے کے بعد اپنے خلق کی تخلیق کرے۔ خَلق اور خُلق کا مادہ ایک ہے گویا انسان کی تخلیق کا پہلا مقصد یہ ہے وہ اچھے اخلاق پیدا کر کے اللہ کا مطلوبہ انسان بن جائے۔ اچھے اخلاق کی تکمیل کیلئے جناب خاتم النبیینؐ کو بھیجا گیا۔ اچھے اخلاق کی تکمیل ہوجائے تو نئی نئی دُنیاؤں کی تخلیق ہوتی

چلی جائیگی اور دُنیا تعمیری بامقصد اور انسان کیلئے مفید تخلیقات سے بھر جائیگی ورنہ لوگ علم حاصل کرتے رہینگے اور مختلف اکائیوں میں تقسیم ہوتے رہیں گے اور انسان کی تخلیقی مقاصد پورے نہ ہوں گی۔ البتہ مغرب اِس لحاظ سے ہم سے بہتر رہا کہ اُن کی دُنیاوی زندگی تو اچھی رہی ہے۔ ہم مسلمان تو علم کو تقسیم کرکے اور اِس کے حصول سے غافل رہ کر اِس دُنیا سے تو گئے اور گئے اُس دُنیا کیلئے بھی کوئی خاص کام اِس لئے نہ کر سکے کہ یہ دُنیا ہی تو آخرت کیلئے کھیتی ہے۔

☆......☆......☆

ہمارے تعلیمی مسائل

پاکستان کی ساٹھ سالہ تاریخ میں ہمارا تعلیمی مسئلہ ہمارے بہت سارے دیگر مسائل کی طرح ایسا الجھ گیا ہے کہ ہوش کے ناخنوں کے بغیر اس کا سلجھنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں ملک وقوم کے تعلیمی مسائل کو کبھی سنجیدگی سے لیا ہی نہ گیا ہو تو وہاں یہ امید کرنا کہ کبھی ہم بھی ترقی یافتہ قوموں میں شامل ہو سکیں گے، خیال جنوں کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں ناامیدی کو گناہ سمجھتا ہوں لیکن امید کرنے کے لئے بھی بقول شاعر۔

کچھ تو مزاج یار میں گہرائیاں بھی ہوں

کے مصداق کوئی بنیاد اور کوئی عمل انگیز بھی تو ہونا چاہئے۔

آج دنیا میں جتنی بھی ترقی یافتہ اقوام و ملک ہیں انہوں نے یہ ترقی صرف اور صرف تعلیم کے زور پر حاصل کی ہے۔ آج کی دنیا کی سپر پاور" امریکہ نے دنیا بھر کے قابل اور ذہین لوگوں کو اپنے ہاں اس قسم کے ادارے فراہم کئے جہاں ان کو اپنی محنت کا بہترین معاوضہ ملتا تھا۔ لہٰذا ان لوگوں نے دن رات ایک کر کے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا۔ اسی طرح یورپ نے مسلم سپین کے علمی خزانوں کو اپنے ہاں منتقل کر کے آنے والی نسلوں کے لئے ثریا تک پہنچنے کی بنیادیں فراہم کیں۔

جاپان نے دوسری جنگ عظیم میں اپنی شکست کو فتح میں بدلنے کے لئے اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز کر کے ہی اعلیٰ مقام حاصل کر لیا۔ گراں خواب اور افیمی چینی قوم بھی ماوزے تنگ کی قیادت اور ان کے رفقاء کے علمی منصوبوں کے طفیل دنیا کی ترقی یافتہ اقوام میں شامل ہوگئی۔ اسی طرح کوریا، ملائیشیا اور دنیا کی دیگر اقوام آگے بڑھتی رہیں اور ترقی یافتہ اقوام کی صف میں اپنے لئے جگہ بناتی رہیں۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ مسلمان قوم ہے کہ آج تک بنی اسرائیل کی طرح ایک ہی صحرا میں چالیس سال تک گھومتی رہی اور منزل کی طرف ایک قدم بھی نہ اٹھا سکی۔

اگر ہم اپنے تعلیمی مسائل کا تجزیہ کرنا چاہیں تو بہت ساری وجوہات کے ساتھ ساتھ میرے نزدیک ایک ہی بنیادی وجہ ہے جس کی بناء پر ہم اس اہم ہدف کو حاصل کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ ہمارے ہاں وسائل کا محدود ہونا اور دستیاب وسائل کا ایک بڑا حصہ مسئلہ کشمیر کا قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی پیدا ہونے کی

وجہ سے دفاع پر اٹھنا یقیناً بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے قیام پاکستان سے لے کر آج تک کبھی کسی سنجیدہ کوشش اور منصوبہ بندی کے ذریعے اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ آخر ہمارا سٹیٹ مشن کیا ہے؟

قائداعظم اور ان کے بعض رفقاء کا ویژن پاکستان کے سارے مسائل کے بارے میں بہت واضح تھا۔ م قائداعظمؒ کے نزدیک پاکستان کا بہت جلد اپنے پاؤں پر مضبوطی کے ساتھ کھڑا ہونا سب سے مرجح (Perior) امر تھا لیکن اللہ کو یہی منظور تھا کہ پاکستان کو ترقی کی راہ پر ڈالنے والی شخصیت قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد ہی ہم سے رخصت ہوگئی۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں تیل نہ رہا اگر کہیں رہا بھی تو اس معیار کا نہ تھا جو کہ اپنی لَو کے ذریعے وطن عزیز کو روشنی دے سکے۔

پاکستان میں تعلیم کی طرف توجہ دینے کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہم ابھی تک اس اہم ترین کام کے لئے اپنے بجٹ کا آدھا فیصد، پھر ایک فیصد، پھر ڈیڑھ اور اب کہیں جا کر دو فیصد مختص کرتے رہے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیمی ترقی کے لئے وافر مقدار میں مالیات کی فراہمی ضروری ہوتی ہے لیکن اگر ہم اپنے دستیاب وسائل کو بھی نظم وضبط اور منصوبہ بندی کے ساتھ خرچ کرتے تو کوئی وجہ نہیں کہ اب تک ہم اپنی منزل مقصود کی راہ متعین نہ کر پاتے۔

پاکستان میں تعلیم کی زبوں حالی میں ہمارے ابتر سیاسی حالات کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ قائداعظمؒ اور لیاقت علی خان کی وفات کے بعد جو سیاسی آپا دھاپی یہاں جاری رہی اس میں کسی کو یاد ہی نہ رہا کہ اس نوزائیدہ قوم کا سب سے بڑا مسئلہ تعلیم ہے۔ جنرل ایوب خان کے دورِ صدارت میں تو لطیفتاً نہیں بلکہ واقعتاً ساری وزارتیں تقسیم ہونے کے بعد جب کابینہ کی میٹنگ برخاست ہوئی تو کسی کو یاد آیا کہ وزارت تعلیم تو کسی کو دینے سے رہ گئی۔ دروغ برگردن راوی تب کہیں جا کر صدر صاحب نے اپنے ایک میٹریکولیٹ ملک دوست کو یہ اہم وازارت سونپ دی۔ اس واقعہ سے ہمارے ہاں تعلیم کے لئے حکومتی توجہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دنیا کے سارے ترقی یافتہ ممالک میں پرائمری سطح کی تعلیم کو جو توجہ دی جاتی ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ پرائمری (Primary) کے لفظ ہی سے اس کی اہمیت آشکار ہوتی ہے یعنی بنیادی تعلیم، بنیاد مضبوط ہوگی تو اس پر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ بنیاد ہی میٹرک یا میٹرک میں دو تین

دفعہ فیل ہونے کے بعد تھرڈ ایئر یا سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونے کے بعد کئی سالوں تک بے روزگار پھرنے اور پھر کسی وزیر یا MNA اور MPA کے ذریعے بھرتی ہونے والے اساتذہ کے ہاتھوں رکھی گئی ہو تو ایسی بنیاد پر بنائی گئی عمارت ہر وقت گرنے کے خطرے سے دوچار نہ ہوگی تو اور کیا ہوگی۔

میرے آبائی گاؤں میں ایک معمار کا قصہ آج تک مشہور ہے۔ اس معمار نے ایک کھاتے پیتے گھرانے کے گھر میں ایک دیوار کی تعمیر کی۔ دوپہر کے وقت ان کھاتے پیتے لوگوں نے معمار صاحب کو ''کڑھی'' یا ''لونڑ'' کھلایا جو اس کے مزاج کو اچھا نہ لگا۔ اس کے بعد اس نے جب کام شروع کیا تو آسمان پر بادل گھیر کر آئے اور بارش شروع ہوئی۔ گھر والوں نے معمار سے دیوار پر کچھ چٹائی وغیرہ ڈالنے کا مشورہ مانگا تاکہ تازہ بنی ہوئی دیوار کے بیچ پانی جا کر اس کے گرنے کا سبب نہ بنے۔ معمار نے دھڑلے سے کہا، کوئی چٹائی وٹائی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ دیوار کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ بارش برسنے کے تھوڑی دیر بعد دیوار دھڑام سے گر گئی گھر والوں نے معمار کو شاکی نظروں سے دیکھا تو معمار نے جواب دیا کہ لونڑ [کڑھی] کھانے والے معمار کی بنائی گئی دیوار میں اتنا ہی دم خم ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے انہی اساتذۂ کرام [الا ماشاءاللہ] کی رکھی گئی بنیادوں کا ہوتا ہے کہ ہمارے اس قسم کے اساتذہ کے ہاتھوں پانچ فیصد بچے تو پرائمری سطح پر سکول کو خیرباد کہہ کر چلے جاتے ہیں۔ پانچ فیصد غربت کے ہاتھوں آگے جانے سے رہ جاتے ہیں، چالیس پچاس بلکہ ہمارے ساٹھ فیصد بچے ہمارے پرائمری سکولوں کی تعلیمی حالت کی پتلی ہونے کی بناء پر مڈل کی سطح کی تعلیم کو حاصل کرنے کے قابل ہی نہیں رہتے۔ اسی طرح مڈل کی سطح تک پہنچ کر اسی فیصد طلباء ''فارغ التحصیل'' ہو جاتے ہیں اور ہم مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے بچوں کو نام لکھانا اور خط لکھنا سکھا کر شرح خواندگی میں اضافہ کر لیا۔

ہمارے ہاں پرائمری سے لے کر میٹرک تک تعلیم کا منصوبہ ہماری ملکی ضروریات کو مدنظر رکھ کر کبھی بنایا ہی نہیں گیا۔ ہمارے ہاں سکولوں میں کہیں بھی یہ رجحان ہی نہیں اور نہ کوئی یہ پاپڑ بیلنے کے لئے تیار ہے کہ میٹرک کی سطح پر طلبہ کی علمی قابلیت اور ذہنی اپج اور رجحانات کو جانچا جائے اور اس کے مطابق ان کے لئے ملکی ضروریات کو سامنے رکھ کر منصوبہ بندی کی جائے۔

ہمارے ہاں میٹرک کی سطح پر ہر طالب کو والدین کی ہدایت ہوتی ہے کہ برخوردار سائنس کی مضامین پڑھیں تاکہ آپ ڈاکٹر یا انجینئر بن سکیں۔ ایف ایس سی میں بھی یہی رجحان ہوتا ہے جبکہ حال یہ ہوتا ہے کہ بہت

سارے طلبہ کا ذہنی معیار اس پائے کا ہوتا ہی نہیں جو ڈاکٹر یا انجینئر بننے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ ایف ایس سی میں کم نمبروں کی بناء پر طلبہ کا دل ٹوٹ جاتا ہے اور حوصلہ جواب دینے لگ جاتا ہے اور نتیجتاً حصول تعلیم سے محروم رہ جاتا ہے۔ جبکہ ترقی یافتہ ممالک میں مڈل اور میٹرک کی سطح پر اساتذہ اور والدین طالب علم کی ذہنی دلچسپیوں کو سامنے رکھ کر اس کے لئے مستقبل کے ان مضامین کا انتخاب کیا جاتا ہے جس پر ان کی عملی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ لہٰذا جو طلبہ ذہنی لحاظ سے ڈاکٹر یا سائنسدان بننے کی صلاحیتوں کے حامل نہیں پائے جاتے ان کو ٹیکنیکل کاموں (Skills) کی طرف رہنمائی دی جاتی ہے اور سکول اور کالج کی سطح پر اس قسم کا ٹیکنیکل کام سکھایا جاتا ہے کہ وہ عملی زندگی میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کے لئے بھی مفید ثابت ہوتے ہیں جبکہ ہمارے ہاں سادہ میٹرک، ایف اے، ایف ایس سی سے فارغ شدہ طلبہ اپنے معمولی کام بھی اپنے ہاتھ سے کرنے کے قابل نہیں رہتے۔

اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں ہنگامی بنیادوں پر ایسے نصاب تعلیم اور پلاننگ کی ضرورت ہے جو میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی سطح پر طلبہ کو ایسا فنی میدان فراہم کر سکے کہ اپنے ملکی ضروریات کے علاوہ خلیجی اور یورپی ممالک میں ملک کے لئے قیمتی زرِ مبادلہ کمانے میں ممد و معاون بن سکیں گے اور ملک بے روزگاری سے بھی بچ سکے گا.............جاری ہے۔

☆......☆......☆

ہمارے تعلیمی مسائل

[دوسری قسط]

اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی شرح خواندگی بڑھانے کے لئے بجٹ کا ایک اچھا بھلا حصہ مختص کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وطن عزیز کے بہت سارے گورنمنٹ سکولوں میں بیٹھنے کے لئے ٹاٹ اور پینے کے لئے صاف پانی میسر نہیں ہوتا۔ یہ بات بھی فکر انگیز ہے کہ اساتذہ انتظامی کیڈر میں آکر سکولوں کو بہتر بنانے اور بچوں کی تعلیمی سہولیات کے لئے مختص رقم ہڑپ کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے۔ ہمارے دیہات کے گورنمنٹ سکولوں میں عمومی طور پر اساتذہ کی تعداد کبھی بھی طلبہ کی ضروریات کے مطابق نہیں رہی اور سائنس کے مضامین کے اساتذہ تو برائے نام ہی رہے۔ان سارے مسائل کے مبنی برحقیقت ہونے کے باوجود تعلیم سے منسلک ہمارے مسائل کچھ اور ہیں جن میں چند کا ذکر سطور ذیل میں کیا جاتا ہے۔

وطن عزیز میں تعلیم کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تعلیم کو کبھی اہم مسئلہ سمجھا ہی نہیں گیا۔اس لئے اسے حل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں نہیں۔ کیا دنیا میں ایسا بھی کوئی ملک ہوگا جہاں ملکی ویژن اور مفادات کو نظر انداز کر کے کوئی تعلیمی پالیسی بنائی اور چلائی جاتی رہی ہے۔ ماہرین تعلیم کے مطابق تعلیم کا مقصد فرد کی تعمیر کے ذریعے ملت کی تعمیر ہے۔علم کے ذریعے انسانی کردار کی تعمیر ہوتی ہے اور اسی انفرادی کردار کے ذریعے قوم وملت کی اجتماعی تشخص کی ساخت وتشکیل وجود میں آتی ہے۔ پاکستان میں اس کی طرح کبھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کیونکہ پاکستان جس نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا اس کو چلانے کے لئے بھی نظریاتی لوگوں کی ضرورت تھی۔ قیام پاکستان کے بعد دو تین سال بعد ہی چند ایک نظریاتی شخصیات جب اس دنیا سے رخصت ہوئیں تو اس کے بعد تو سیاسی طور پر جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ کسی کو یاد ہی نہیں رہا کہ ہم نے پاکستان کس لئے بنایا تھا؟ ہمارے ہاں پاکستان بنانے والی نسل میں سے چند ایک انفرادی مثالوں کے علاوہ وہ مثالی استاد پیدا ہی نہ ہوا یا پیدا ہونے ہی نہیں دیا گیا جو قوم کو ترقی کی راہوں پر ڈالتے ہیں۔

پاکستان میں تو معلّمی کا پیشہ مجبوری کا پیشہ بن کے رہ گیا۔ پنجاب کے جاگیردار، سرحد کے خوانین، بلوچستان وسندھ کے وڈیرے اپنے مزارعوں، نوکروں چاکروں، غلاموں اور خادموں کی صورت میں موجود

عوام کالانعام کو پڑھنے لکھنے کے مواقع دے کر اپنے پاؤں پر خود کلہاڑا مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے دیہاتوں میں پرائمری سکول ان جابر اور مقتدر طبقات کی اجازت سے ان کے احکام کے مطابق چلا کرتے تھے اور ان میں پڑھانے والے اساتذہ کرام ان چودھریوں وغیرہ سے ''میاں جی'' کے لقب کے ساتھ ان گھروں سے مزارعوں کے ہاتھوں لسّی اور مکئی کی روٹی کھا کر چند ایک بچوں کو چند ایک لفظ پڑھا کر اس عظیم قومی فرض منصبی سے سبکدوش ہو جاتے تھے جسے پیغمبرانہ پیشہ کہا جاتا ہے۔

بھئی! سیدھی سی بات ہے جس معاشرے کے استاد کو معاشرے کے افراد اور حکومت نے کبھی عزت کی نگاہ سے دیکھ کر عزت کا مقام دیا ہی نہ ہو اور وہ اپنے معاشی و معاشرتی مقام کی بناء پر بے چارہ ہمیشہ احساس کمتری میں رہا ہو وہ قوم کے افراد اور آنے والی نسلوں کو کیا خودداری کا سبق دے گا۔

انگریز نے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں پر بالعموم اور مسلمانوں پر بالخصوص بڑا ظلم ہی یہ کیا ہے کہ ہمارے استاد کو معاشرتی طور پر ایسے حالات سے دوچار کیا گیا جس میں وہ ڈی گریڈ ہی بن کے رہا۔ انگریزی کو دفتری اور حکومتی زبان بنا کر کتنے ہی استاد بے روزگار ہو کر احساسِ محرومی کا شکار رہے اور انگریز کے جانے کے بعد بھی آج تک یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ انگریزی زبان کی اہمیت سے بطور زبان اور آج کی سائنس اور رابطے کی زبان ہونے کی بناء پر انکار ممکن نہیں لیکن انگریزی زبان کے جاننے والے کو عقل و دانش کا پیکر سمجھنا بالکل دوسری بات ہے۔ اس فکر نے پاکستان میں وہ غدر مچایا کہ قوم منزل مقصود سے بھٹک گئی ہے۔ گذشتہ ساٹھ سال میں نہ ہم نے انگریزی سیکھی اور نہ ہی اپنی مادری زبان کا حق ادا کر سکے۔ اس بات پر سارے دانشور اور ماہرین تعلیم متفق ہیں کہ ہر بچہ بات کو اپنی مادری زبان ہی میں اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ ہم رواداری، فیشن اور بازار میں اہمیت (Market Orientation) کی بناء پر اور کچھ ذہنی غلامی کی وجہ سے ''دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا'' کے مصداق نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم، اے لیول، او لیول، ایچی سن، ایڈورڈز، بیکن ہاؤسز، سینٹ جان، کانوئنٹ، گرائمر اور اس قبیل کے سارے پبلک سکولز، کاروبار، جلب زر، لوگوں کی مجبوریوں کا استحصال اور ملکی سطح پر قومی تعلیمی منزل متعین نہ ہونے کے شاخسانے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عظیم قربانیوں کے طفیل حاصل کردہ عظیم ملک بیش بہا وسائل اور بہترین سٹریٹیجک اہمیت کے باوجود عظیم قوم سے محروم ہو رہا ہے۔ کہیں پنجابی ہیں تو کہیں بلوچی، کہیں سندھی تو کہیں پٹھان، اب خیر سے سرائیکی اور مہاجر بھی الگ قومیتوں کے دعویدار، اگر نہیں

ہے تو صرف پاکستانی قومیت نہیں ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے ہے کہ پاکستانی قومیت کی تشکیل کے لئے نئی نسل کو نہ پڑھایا گیا اور نہ سکھایا گیا۔ نئی نسل کو کسی مشنری اور ویژنری استاد کی شاگردی کا موقع ہی نہیں ملا۔ مادہ پرستی کی آپا دھاپی میں ہم سب مملکتِ خداداد کے قیام کے مقاصد ہی کو بھول گئے۔ کیونکہ قومِ رسولؐ ہاشمی پہلے مغربی ومشرقی حصوں میں بٹ گئی اور اب مزید قومیتوں کے نیچے دبی ہوئی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے استاد اور شاگرد کا رشتہ بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ایک وقت تھا کہ استاد کے علمی مقام کی بناء پر مسلمان شاگرد اپنے استاد کے حضور ہدیہ دل پیش کرنے کے لئے تیار رہتا تھا اب زمانہ ایسا بدل گیا کہ:

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے!
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجئے"!

انگریزی نظامِ تعلیم نے نہ صرف ہمیں قومی طور پر پھاڑ دیا بلکہ دینِ اسلام اور ہماری تہذیب وتمدن سے بھی دور کر دیا۔ موجودہ نظام تعلیم کے ذریعے پاکستان کی چار قومیتوں کے درمیان رابطے کی زبان انگریزی ہو جائے گی کیونکہ اردو زبان کو کبھی قومی زبان کا درجہ دیا ہی نہیں گیا اور نہ ہی ہمارے آنے والی نسلوں کے لئے اس "قومی زبان" میں کوئی کشش چھوڑی گئی ہے۔ اس وقت نظامِ تعلیم کی وجہ سے مملکتِ خداداد میں جو جنریشن گیپ پیدا ہوا ہے اس کا اندازہ تنور سے روٹیاں لینے والے انگلش میڈیم کے ایک پٹھان بچے اور ایک پٹھان تنورچی کے درمیان اس مکالمے سے لگایا جا سکتا ہے کہ بچہ الیون (11) روٹیاں مانگ رہا تھا اور ان پڑھ پٹھان تنورچی اشاروں کی زبان میں الیون کے معنی پوچھ رہا تھا۔ جس کے نتیجے میں دونوں طرف سے انگلیوں پر اشارہ کر کے تعداد بتائی گئی۔

ہم نادانستگی میں اپنی تہذیب وتمدن سے نئی نسل کو کاٹ کر اسلامی تعلیمات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صفات شجاعت، صداقت، امانت وغیرہ سے دور کر رہے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ایک عجیب مخلوق وجود میں آرہی ہے جو نہ پاکستانی ہے، نہ پٹھان ہے نہ پنجابی ہے نہ سندھی اور نہ بلوچی، بلکہ ایک ایسی نسل جو ایک جملے میں دو لفظ انگریزی کے، ایک آدھ لفظ اردو اور ایک آدھ اپنی مادری زبان کا بولتی ہے اور بزرگ ٹک ٹک دیدم،

دم نہ کشیدم کی تصویر بنے رہتے ہیں۔

اتاترک کو بھی اس کے آقاؤں نے یہی پٹی پڑھائی تھی کہ نئی نسل کو ''ترقی کی راہ'' پر ڈالنے کے لئے ان کو اپنے ماضی سے کاٹ دو اور اس کا آسان نسخہ یہ ہے کہ ترکی زبان کا رسم الخط عربی سے تبدیل کر کے رومن کر دو۔ اس فیصلے سے ترکی کی آنے والی نسلیں اپنے ہزاروں سال پر محیط دینی علوم اور تہذیب و تمدن سے کٹ کر رہ گئی اور آج جس کشمکش میں گرفتار ہے وہ اہل نظر کے سامنے ہے۔

اگر ہم نے پاکستان میں قیامِ پاکستان کے مقاصد کے پیشِ نظر قومی و ملی مفادات پر مبنی نصاب تعلیم بنا کر آنے والی نسلوں کو پیش نہیں کیا تو اس کے نتائج اسلام اور پاکستانیت سے دوری کی صورت میں نکلیں گے جو ملک و قوم کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔

آج کے بدلتے اور نازک حالات میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ معاشرے میں استاد کو اس کا وہ جائز مقام دلایا جائے جو قوموں کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے، اس سلسلے میں چند ایک اہم باتوں کو پیش نظر رکھ کر اگر سفر شروع کیا جائے تو اس کے بہت خوشگوار نتائج برآمد ہوں گے۔

۱۔ پہلی ہی فرصت میں سارے پاکستان کے لئے بلا امتیازِ صوبہ و قومیت ایک ہی قومی نصاب بنا کر پیش کیا جائے۔

۲۔ اسلامیات، مطالعہ پاکستان اور اردو کی لازمی مضامین کی حیثیت کو بی اے کی سطح تک برقرار رکھا جائے۔ چاروں صوبوں میں اسلامیات کا ایسا نصاب بنا کر پیش کیا جائے جو عقائد و اعمال کے حوالے سے قومی یکجہتی میں بنیادی کردار ادا کرے۔

۳۔ انگریزی زبان کے ساتھ چینی، فرانسیسی، جرمنی اور روسی زبانوں کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جائے کیونکہ یہ زبانیں بھی سائنس ٹیکنالوجی کی زبانیں ہیں چینی زبان تو پاکستانیوں کے لئے سیکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ مستقبل قریب میں ''تہذیبوں کے تصادم'' کا واقعہ اگر خدانخواستہ پیش آیا تو چین ہمارے ساتھ کھڑا ہوگا۔ لہٰذا ان کی زبان سمجھنا لازمی ہے۔

۴۔ سائنس گروپ کے طلبہ کے لئے سائنسی مضامین یورپی ممالک کے نصاب کے مطابق رکھے جائیں۔

۵۔ آرٹس گروپ کے طلبہ کے لئے زبانوں کی اہمیت کے پیش نظر عربی کو لازمی قرار دیا جائے اس کے ذریعے قرآن و حدیث سیکھنے کے علاوہ عرب ممالک کے ساتھ روابط اور روزگار کے حوالے سے بھی فوائد حاصل ہوں گے۔ تصور کیجئے کہ خلیجی ممالک میں ہندوستان کے متعین سفراء روانی کے ساتھ عربی بولنے والے ہوتے ہیں جبکہ پاکستان کے سفراء الا ماشاء اللہ۔

۶۔ چاروں صوبوں میں آرٹس کے ذہین طلبہ کو عبرانی زبان سیکھنے کی طرف متوجہ کیا جانا چاہئے۔امریکی اور اسرائیلی اپنے قومی مفادات کے لئے آج کل عربی اور پشتو زبانیں سیکھ رہے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمیں یہ احساس ہو جائے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں بہت بڑے بڑے نقائص موجود ہیں اور ان نقائص کو ختم کرنے کے لئے قومی سطح پر قومی وملی احساس زیاں رکھنے والے افراد پر مشتمل کمیشن وجود میں آجائے تو بہت سارے دیگر مسائل بھی زیر بحث لائے جاسکتے ہیں اور ان کا حل ڈھونڈا جاسکتا ہے۔اس حل کو تعلیمی انقلاب سے تعبیر کیا جائے گا کیونکہ پاکستان میں موجودہ نظام تعلیم کو دیکھتے ہوئے انقلابی اقدامات کے بغیر اصلاح ممکن نہیں۔

☆......☆......☆

ہمارے تعلیمی مسائل اور نئی پالیسی

ہمارے ملک میں بے شمار مسائل ہیں جن کو حل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش حکومتی سطح پر بہت کم کی گئی ہے لیکن تعلیم کے مسائل بہت گھمبیر ہیں۔ یہ بات کسی بھی اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں کہ ممالک اور اقوام کی ترقی بہترین تعلیم و تربیت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ آج کے ترقی یافتہ ممالک نے تعلیم کو ہنگامی اور ترجیحی بنیادوں پر توجہ دے کر ترقی حاصل کی ہے۔

میں اس تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کہ قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک تعلیم کی طرف مناسب اور ضروری توجہ کیوں نہ دی گئی۔ البتہ اتنی بات ضرور کہوں گا کہ پاکستان میں جاگیردارانہ معاشرتی نظام نے تعلیم و تعلم کو بہت بڑا نقصان پہنچایا ہے، جاگیرداروں، سرداروں اور وڈیروں نے عوام کو غلام ابن غلام بنائے رکھنے کے لئے ایک منصوبہ کے تحت تعلیم سے دور رکھا۔ اگر کہیں کسی بندہ خدا نے کوشش کو بھی کی کہ مخلوقِ خدا پڑھ لکھ کر اپنے آپ کو پہچاننے کے قابل ہو جائے تو اِن خواص نے ہر ایسی کوشش ناکامی سے دوچار کیا۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیامِ پاکستان کے ساٹھ برس بعد بھی پاکستان کی آبادی میں تعلیم تو رہی ایک طرف، شرح خواندگی بھی پینتیس چالیس فیصد سے نہ بڑھ سکی۔

اِس سلسلے میں کسی ایک حکومت یا شعبے کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا، کیونکہ یہ بحیثیت قوم ہماری قومی غفلت نے ہمیں اِس مقام پر پہنچایا ہے کہ پاکستان ایک زرعی ملک ہونے کے باوجود گندم اور آٹے کے بحران کا شکار رہتا ہے۔ بجلی، گیس اور دیگر بنیادی ضروریات کی اشیاء غریب عوام کی رسائی سے باہر ہیں۔ صحت کے مسائل کا تعلق بھی تعلیم کے فقدان سے ہے۔

ہمارے ہاں ہر پنج سالہ منصوبہ بندی میں تعلیمی پالیسی کا ذکر بھی ہوتا ہے اس سلسلے میں ہمیشہ پاکستانی معاشرے کا پسِ منظر اور مستقبل کی ضروریات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیشہ نت نئے تجربات کئے جاتے ہیں اور جو پالیسیاں بنائی جاتی ہیں اُن پر کبھی سو فیصد تو ایک طرف پچاس فیصد تک بھی عمل نہیں کیا گیا۔

دنیا بھر کی تعلیمی پالیسیوں میں بنیادی یا پرائمری تعلیم کو بنیادی اہمیت دی جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں آج

تک یہ طے نہ ہو سکا کہ بچوں کو پرائمری تعلیم کس زبان میں دی جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علاقوں میں مکمل انگلش میڈیم، بعض میں اُردو، اور بعض میں مادری زبان پر زور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ضرورت اِس بات کی ہے کہ پاکستان بھر میں قومی زبان کے طور پر اُردو کو میڈیم کے طور پر لازمی قرار دیا جائے کہ اُردو ہی پاکستان میں آباد لوگوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کیلئے ایک اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔

اُردو زبان کو بطور میڈیم اختیار کرنے سے پاکستان کے کسی علاقائی یا صوبائی زبان کو کوئی خطرہ نہیں اور اُردو کے ساتھ ساتھ صوبائی اور علاقائی زبانیں بطور زبان یا مضمون کے اُس سطح تک پڑھانا چاہئے کہ ہر طالبعلم اپنی مادری زبان روانی کے ساتھ پڑھ لکھ سکے۔ لیکن ہمارے ہاں جب آواز بلند کی جاتی ہے کہ مادری زبان کو بطور لازمی مضمون ہائی لیول تک پڑھایا جائے تو میرے نزدیک یہ طلبہ پر ایک اضافی بوجھ ہوگا کیونکہ پاکستان میں اُردو کے سوا بولی جانے والی زبانوں میں ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی زبان میں بھی سائنسی یا دیگر علوم کے حوالے سے ابھی اُس سطح کا کام نہیں ہوا ہے کہ اس کو بطور لازمی مضمون کے پڑھا کر طلبہ اعلیٰ تعلیم میں اس کے ذریعے آگے بڑھ سکیں۔

مادری زبان کی اہمیت کے اعتراف کے ساتھ دنیا بھر کی زبانیں اہم ہیں لہٰذا تعلیم و تعلم میں پالیسی کے حوالے ہماری ترجیحات یہ ہونی چاہئے کہ ہم اپنی نسلوں کو مستقبل کی تیاری کیلئے اُسی زبان میں تعلیم دلائیں جس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کا حصول آسانی کے ساتھ ہو سکے۔ اِس سلسلے میں انگریزی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ چین، فرانس، روس، جرمنی یا جاپان کوریا وغیرہ میں بھی اپنی اپنی زبانوں پر افتخار و اصرار کے باوجود سائنسی علوم انگریزی زبان کے ذریعے پہنچی ہیں۔ اُنہوں نے ایسے علماء اور سکالرز کی جماعتیں تیار کیں جنہوں نے اپنی زندگیاں علوم کیلئے وقف کیں اور اُسی جماعت نے دنیا بھر کی سائنس و فنی تعلیم کو اپنی زبانوں کے ذریعے منتقل کیا۔ اب وہاں اُن کی اپنی زبانوں میں دنیا بھر کے علوم پر کُتب آسانی سے دستیاب ہیں جن کے ذریعے نصابات کی تدوین ہوتی ہے۔

ہمارے ہاں انگریزی زبان کو فیشن، مرعوبیت اور اپنے آپ کو اعلیٰ تعلیم یافتہ یا کچھ اور ثابت کرنے کیلئے سیکھنے اور سکھانے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں [اِلّا ماشاء اللہ] جس کے نتیجے میں نہ ہم انگریزی سیکھ سکے اور نہ سائنس و فنی علوم۔

اب جبکہ ایک دفعہ پھر نئی تعلیمی پالیسی منظر عام پر آنے والی ہے، چاہئے تھا کہ پرائمری سطح سے لے کر ہائر ایجوکیشن تک کی سطح کے پاکستان بھر کے ماہرین کے ضلعی اور صوبائی سطح کے ورکشاپوں کے ذریعے آراء وتجاویز اکٹھی کی جائیں پھر اسلام آباد میں ملکی سطح پر منتخب ماہرین کے ذریعے قومی وملکی سطح کا ایک ایسا نصاب مرتب کر کے سامنے لایا جاتا جو پاکستان میں یکساں نظام تعلیم کے لئے راہیں ہموار کرتے ہوئے معاشرے کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر مستقبل کی منصوبہ بندی کا حامل ہوتا۔

اخبارات کے ذریعے نئی تعلیمی پالیسی جو خدوخال سامنے آئے ہیں ان میں پرائمری سطح پر K.G سے انگریزی کو بطور لازمی مضمون پڑھانے پر ایک دفعہ پھر زور دیا گیا ہے۔اس بات کی بہت اہمیت کے باوجود میں یہاں اس خدشے کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہمارے ہاں جب تک پرائمری سطح کی تعلیم کے حوالے سے، جب تک بنیادی وانقلابی تبدیلیاں نہیں لائی جاتیں۔تب تک امریکہ اور برطانیہ کے نصاب تعلیم کے نفاذ کے بعد بھی کوئی خوشگوار اور مثبت نتیجہ سامنے نہیں آسکتا ہے۔

حکومت نے اس بات کا عندیہ دیا ہے کہ اب پرائمری سکولوں میں پڑھانے کے لئے اساتذہ کے لئے کم از کم معیار تعلیم بی اے، بی ایڈ ہوگا لیکن اس سلسلے میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا جب تک ہمارے ہاں پرائیویٹ نظام تعلیم کے ذریعے بی اے اور بی ایڈ ہوتے رہیں گے۔نتیجہ ڈھاک کے تین پات کے سوا مختلف نہیں ہوگا۔

ہمارے ہاں اس وقت پرائیویٹ امتحانی ہالوں کا جو منظر ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور اب تو ماشاء اللہ ایک دفعہ پھر سٹوڈنٹس یونین بحال ہو رہے ہیں گویا کریلا اور نیم چڑھا۔جہاں تک بی ایڈ اور ایم ایڈ کی بات ہے، تو اس جنس کی ڈگریاں بانٹنے والے ادارے پاکستان میں بے شمار، وہ یونیورسٹیاں جو سائنس وٹیکنالوجی کے نام سے قائم ہیں، ایم اے اسلامیات اور بی ایڈ وایم ایڈ کے ستارے اپنا کاروبار چلا رہی ہیں۔اس کے علاوہ پرائیویٹ سیکٹر میں ساری یونیورسٹیاں یہ ڈگریاں دے رہی ہیں کہ یہ ایک منافع بخش کاروبار ہے، لہٰذا حکومت کو اس حوالے سے ذرا سا سوچنا ہوگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بی اے بی ایڈ کے نام پر تنخواہیں تو وصول کی جائیں اور نتیجہ وہی پہلے والا۔

حقیقت میں ہماری پرائمری سطح کی تعلیم کا انفراسٹرکچر مکمل تبدیلی کا متقاضی ہے۔موجودہ گورنمنٹ پرائمری سکولوں میں محتاط اندازے کے مطابق زیادہ تر اساتذہ وہ حضرات ہیں جو بے روزگاری سے بچنے کے

لئے کسی نہ کسی طرح سے پڑھانے کی طرف آتے ہیں ورنہ یہ ان کا پسندیدہ یا ارادتاً اختیار کردہ وظیفہ نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ہمارے کمزور نظامِ تعلیم کی وجہ سے اساتذہ کرام کی وہ تربیت ہوئی نہیں ہوتی، جو شاہین بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

مجھے آج بھی اپنے سکول کا زمانہ یاد ہے۔ ہمارے تین استاد تھے۔ وہ تینوں حقہ پیتے تھے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ یہ ہماری چھوٹی سے کلاس میں بیٹھ کر پیتے تھے۔ ہمارا کمرۂ جماعت دھوئیں سے بھر جاتا تھا اور ہم کھانسنے لگنے کے ساتھ نکوٹین بھی لیتے رہتے تھے۔ ہمارے بہت سارے کلاس فیلو سگریٹ نوش اسی وجہ سے بن گئے تھے۔ طلبہ کے سامنے نسوار منہ میں ڈالنا تو عام سی بات ہے۔ پھر ہمارے دیہاتوں میں پرائمری اور ہائی سکولوں میں بھی، اساتذۂ کرام [الا ماشاءاللہ] طلبہ کے لئے جو زبان استعمال فرماتے ہیں۔ اس میں قسم قسم کے مزاحیہ القابات و خطابات کے علاوہ پشتو زبان میں جو الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ کبھی کبھار ہماری محفلوں میں بطور مذاق دہرائے بھی جاتے ہیں، ہمارے ہاں دیہاتوں میں طلبہ پر غصہ ہو کر ''اُو دخر بچیہ'' کہنا تو عام سی بات ہے۔ حالانکہ یہیں سے ان معصوم طلبہ کو بات کرنا سکھایا جاتا ہے۔ طلبہ اخلاقیات کے حوالے سی تہی دامن ہو کر نکلتے ہیں تو اس کے مابعد اثرات معاشرے پر مرتب ہوئے ہیں۔ جس کا نتیجہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس سلسلے میں اور بھی بہت سی چیزیں قابلِ غور ہیں۔ لیکن پرائمری سطح پر انقلابی تبدیلیاں لانے کے لئے اساتذۂ کرام کے انتخاب کے لئے ایک بہترین اور میرٹ کے مطابق پیمانہ بنانا وقت کی اشد ضرورت ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ وطنِ عزیز میں تعلیم و تعلم کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرے تاکہ ہم بھی دنیا کی ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ اقوام کی صف میں کھڑے ہو سکیں۔

☆......☆......☆

ہماری لائبریریاں کتب بینی اور طلبہ و طالبات

مسلمان اور کتاب چولی دامن کا ساتھ ہے۔ نبی ﷺ پر پہلی وحی کا پہلا لفظ "اقراء" [پڑھ] ہے۔ گویا اسلام میں صرف مسلمان کو نہیں بلکہ ہر انسان کو پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے ہر آدمی کو پڑھنے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ علم کا تعلق مخصوص طبقات کے ساتھ تھا۔ اسلام نے ہر مسلمان پر پڑھنا لکھنا واجب کر دیا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا ہے۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ ""علم کا حصول ہر مسلمان پر فرض ہے" اس لئے اسلام میں اس کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ قرآن و حدیث میں حصولِ علم پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے اور نبی ﷺ نے غزوۂ بدر میں قید میں آنے والے پڑھے لکھے کافروں سے مسلمان بچوں کو پڑھنا لکھنا سیکھنے کا موقع فراہم کرایا۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام پر کتب اور صحائف نازل فرمائے۔ انہی کتب کے مطالعہ اور اس پر عمل کے ذریعے انسان کی اصلاح کا راستہ متعین کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آخری، کامل، جامع، مقدس اور ہر قسم کے شک و شبہ اور ترمیم و تحریف سے محفوظ ترین کتاب قرآن عظیم الشان کو قرآن اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے گویا مسلمان ہی دنیا میں صاحبِ کتاب ہیں اور مسلمان ہی کو دنیا میں پڑھا کو ہونا چاہیئے۔ اس بات میں کوئی شک بھی نہیں کہ جب تک ہمارا واسطہ اور رابطہ قرآن کریم [اُم الکتب] کتابوں کی ماں کے ساتھ رہا۔ دنیا میں مسلمان ہی سب سے زیادہ صاحب علم اور صاحب کتاب رہے۔ مسلمان ہی نے دنیا کو یونانی کتب سے روشناس کرایا۔ مسلمان ہی نے سپین میں علمی ادارے اور لائبریریاں قائم کر کے یورپ میں "اَلْعِلْمُ قُوَّةٌ" (Knowledge is Power) کا ماٹو جاری کر دیا۔ مسلم سپین کے تمام بڑے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم تھیں جیسے آج ہمارے نوجوان حصول علم کے لئے یورپ اور امریکہ جاتے ہیں اسی طرح ان کے نوجوان Pyrenees کی پہاڑیوں کا سلسلہ عبور کر کے فرانس، اٹلی اور جرمنی سے ہسپانیہ آتے تھے۔ مسلمان ہی نے بغداد اسکندریہ میں وہ لائبریریاں قائم کیں جن کو ہلاکو جیسے لوگوں نے جب دریا برد کر دیا تو مہینوں دریاؤں کا پانی سیاہ بہتا رہا۔

مسلمانوں کے ہاں اسی دور میں یہ مقولہ عام ہوا کہ خیر جلیس الزمانِ کتاب "دنیا کا بہترین ساتھی کتاب ہے"۔ مسلمان نے جب کتاب کو ساتھی بنایا تو اسلامی تاریخ میں علماء فضلاء، ادباء اور سائنسدانوں اور محققین اور

ہر شعبہ زندگی کے ماہرین کے ایسے عبقری گروپس (Think Tanks) وجود میں آئے جنہوں نے مسلمانوں کو ایک ہزار سال تک سوپر پاور رہنے کے لئے بنیادیں فراہم کیں۔ اسی سنہری دور میں ابن خلدون اور ابن رشد جیسی شخصیات کے بارے میں یہ بات ہم تک پہنچی ہے کہ انہوں نے پوری زندگی میں صرف دوراتوں کو مطالعہ نہیں کیا۔ ان دوراتوں میں سے ایک ان کی شادی کی رات اور دوسری موت کی رات بیان کی جاتی ہے۔

کتاب کے ساتھ ہمارا رشتہ اتنا مضبوط تھا کہ ہمارے بعض علماء کو جب دنیادار حکمرانوں نے قید کی سزائیں دیں تو وہاں بھی کتب بینی کا شغل جاری رکھا۔ امام سرخسیؒ کے بارے میں تو لکھا گیا ہے کہ ان کو جب حاکم وقت نے ایک کنویں میں قید کیا تو آپ کے طلبہ وہاں آکر کنویں کے منڈیر پر بیٹھ کر آپ سے درس لیتے رہے اور حنفی فقہ کی مشہور کتاب ''اُصولِ شاشی'' آپ نے اس قید کے دوران پایہ تکمیل تک پہنچائی۔

مسلمان امت کے دورِ عروج کی کتب بینی اور تعلیم و تعلم کی داستانیں اتنی طویل اور دلچسپ ہیں کہ یہ مختصر سا کالم اس کا مکمل احاطہ کر ہی نہیں سکتا۔ مشہور ادیب اور عالم امام جاحظ کی موت کتابوں کے ڈھیر کے نیچے ہوئی یعنی وہ اپنی شاندار لائبریری میں محو مطالعہ تھے کہ اوپر سے آپ پر کتب گر گئیں اور آپ ان کے نیچے دب کر رہ گئے۔

برصغیر پاک و ہند میں ہمارے دورِ زوال میں مسلمانوں میں کتب بینی کا اتنا رواج تھا کہ تقریباً ہر قابل ذکر شہر میں ''آنہ لائبریری'' کا قیام شہر کے حسن اور تہذیبی اقدار میں لازمی عنصر کے طور پر شمار ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسی دور میں ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاں اس پایے کے علماء وفضلاء پیدا ہوئے کہ انگریزوں کی غلامی میں بھی انہوں نے اپنی جداگانہ شان و شوکت قائم رکھی۔

ایک طرف علی گڑھ تحریک کے راہنمایانِ قوم تھے اور دوسری طرف دیوبند، جامعۂ ملیہ، دارالندوہ جیسے ادارے وجود میں آئے جنہوں نے ہمیں اس ابتلاء کے دور میں قحط الرجال سے بچایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے انگریز کے قید خانے میں ''غبار خاطر'' جیسی کتاب بغیر کسی کتاب اور حوالے کے لکھ ڈالی جس کو پڑھ کر انسان آپ کے حافظے اور کتب بینی کے ثبوت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس زمانے میں مولانا شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندوی نے ''دارالمعارف'' اعظم گڑھ میں وہ لائبریری قائم کی جس کے ذریعے آج تالیف و تصنیف اور کتب بینی کا سلسلہ جاری ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اپنی ذات میں ایک انجمن قائم کر کے تالیف و تصنیف اور کتب بینی کا جو معیار قائم کیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا

ہے کہ چھے جلدوں میں قرآن پاک کی شہرہ آفاق تفسیر تیس سالوں کی ان تھک علمی جدوجہد کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ آپ نے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد ایک جگہ اس زندگیٔ ناپائیدار کو تعلیم و تعلم کے لئے ناکافی سمجھتے ہوئے لکھا ہے کہ ''میرے بس میں ہوتا تو میں قبر میں بھی تختوں کے بجائی کتابیں چنواتا''۔

یہ اور اس قسم کے دیگر دلچسپ واقعات ہمارے اس دور کی یادگار ہیں جب ہم کتابوں سے محبت کرتے تھے۔ کتابوں سے محبت کرنا مسلمانوں کی گھٹی میں ہے۔ کیونکہ مسلمان جب پانچ سال کا ہو جاتا ہے تو وہ قرآن کریم پڑھتے ہوئے اس عظیم آیت کے ذریعے کتاب بینی کا درس لیتا ہے کہ "ذلك الكتب لاريب فيه" یہ [قرآن] وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں' ، جس طالب علم نے اس آیت کے مفہوم کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنایا اس کو مکتب عشق سے پھر چھٹی نہ ملی اور نتیجتاً اس راستے پر گامزن ہوا جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ''دنیا میں انبیاء کے علاوہ جتنے بھی بڑے لوگ ہیں وہ سب مطالعے کی زور پر بنے ہیں''۔

کتابوں کے مطالعے میں انسان کو منزل مقصود کے نشان راہ ملتے ہیں۔ پشتو کے عظیم صوفی شاعر عبدالرحمٰن بابا نے شاید اس شعر میں اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

زوړ نه سر په مطالعه د کتاب خوښ يم
چه د يار د خد و خال نخښ پکښې دي

یہ وہ دور تھا جب ہم کتاب پڑھتے تھے تو کتاب کی برکت سے دور غلامی سے بخیر و خوبی نکل کر قیام پاکستان کی صورت میں دنیا کی بہترین نعمت آزادی سے فیض یاب ہوئے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ قیام پاکستان کے بعد سب سے زیادہ زور اور توجہ تعلیم و تعلم، تالیف و تصنیف کتب اور لائبریریوں کے قیام پر دی جاتی لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شد۔ ہم نئی لائبریریاں تو کیا قائم کرتے، وہ میراث بھی گنوا دی جو اسلاف سے پائی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد کتاب ہماری مطمحِ نظر ہی نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ وطن عزیز میں اول تو علمی معیار کی کوئی لائبریری ہے ہی نہیں، اگر کہیں کوئی ایک آدھ کسی پاکستانی معیار کی ہے بھی، تو وہاں کے منتظمین، عملہ، حالات، میز کرسی کی عدم دستیابی ناخوشگوار ماحول، گرمی، سردی سے بچ کر کتب بینی کا مزہ لوٹنے کی جگہ میسر ہی نہیں ہے۔

یونیورسٹیوں، تعلیمی اداروں اور کالجوں میں قائم لائبریریوں میں موجود کتب کا نہ کوئی ریکارڈ ہے اور نہ کوئی ترتیب۔ کمپیوٹر کے اس دور میں آپ ہماری کسی لائبریری کے منتظم سے کسی کتاب کے بارے میں پوچھئے تو ایک

گھنٹہ بعد آپ سے ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ مخاطب ہوگا۔ یہ کتاب کوئی صاحب ایشو کر کے لے گیا ہے۔ بھئی کون، کب، واپسی کب تک ممکن ہے، معلوم نہیں۔ کسی بھی لائبریری میں ایک گھنٹہ اگر آپ کتابوں کے الٹنے پلٹنے میں مشغول رہیں تو وہاں سے نکلنے کے بعد آپ کی پہچان مشکل سے ہوگی کیونکہ کتب پر موجود گردوغبار سے آپ کے بال، بھنویں اور پلکیں اور کپڑے وغیرہ رنگ تبدیل کر چکے ہوں گے۔ ورنہ آزمائش شرط ہے۔ میں تو پشاور شہر کی چند ایک بڑی لائبریریوں کا حال دیکھ کر آیا ہوں آپ کسی دن یہ قیمتی شوق پورا کر سکتے ہیں۔

پرائیویٹ سیکٹر میں کتابوں کی چھوٹی موٹی دکانیں محض کاروباری مقاصد کے لئے کھولی گئی ہیں وہاں آپ کھڑے ہو کر یا چند لمحوں کے لئے بیٹھ کر کتب کی ورق گردانی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کسی کتاب کی دلچسپ عبارت یا تعارف کے پڑھنے میں محو ہو گئے تو آپ کو چونکانے کے لئے کوئی چھوٹا حاضر ہوگا کہ سر جی! یہاں کتاب بیچنے کے لئے ہے پڑھنے کے لئے نہیں۔

پاکستان میں بالعموم اور صوبہ سرحد میں بالخصوص کتب بینی کے رجحان کے فقدان کے سبب جن شہروں میں پرائیویٹ لائبریریاں یا کتاب کی دکانیں تھیں، وہاں یار لوگوں نے مارکیٹ کی ضرورت اور عوام کے مطالبے کے پیش نظر کوئی ٹکہ ٹک یا تکہ کڑاھی کے دکان کھول لی۔ اس میں ان لوگوں کو کوئی زیادہ قصوروار بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ کاروباری لوگ تو عوام کی مانگ کا خیال رکھ کر ہی کوئی دکان کھولتے ہیں۔ اب جب کوئی عام آدمی تو ایک طرف، تعلیمی اداروں کے طلبہ و طالبات بھی لائبریریوں کا رخ نہیں کرتے تو کتب کا کاروبار کرنے والوں کو باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ کتابوں کی دکان میں بیٹھ کر گاہکوں کے انتظار میں سوکھتا رہے۔

آج کے دور میں کسی بھی قوم و ملک کی ترقی کے جدید پیمانے وہاں پر موجود تعلیمی ادارے اور لائبریریاں ہیں۔ امریکہ کے سوپر پاور بننے میں دنیا کی سب سے بڑی صاف ستھری، منضبط اور کمپیوٹرائزڈ لائبریریوں کا ایک اہم حصہ ہے۔ دنیا کے سارے ترقی یافتہ ملکوں میں بہترین لائبریریاں موجود ہیں۔ دنیا کے سارے متمدن اور ترقی یافتہ ممالک کے شہری اٹھتے بیٹھتے، ہر فارغ لمحہ کتاب بینی میں صرف کرتے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی نے پروفیسر آرنلڈ کی کتاب بینی کا قصہ لکھا ہے کہ بحری جہاز کے انجن میں خرابی کے اعلان سے جہاز کی سواریوں میں ایک ہیجان اور بے چینی سے پھیل گئی تھی لیکن پروفیسر صاحب کو دیکھنے اور

یہ بری خبر دینے کے لئے جب میں ان کے کیبن میں چلا گیا تو وہ کتاب کے مطالعے میں مشغول تھے۔ خبر سننے کے بعد بھی کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا کہ زندگی کے آخری لمحات کا صحیح مصرف کتاب بینی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔

قلم اور کتاب کے ذریعے امن کے قیام کی دعویدار اور علمبردار حکومت کا فرض بنتا ہے کہ صوبہ سرحد میں ضلعی سطح پر ایک بہترین لائبریری کا قیام ممکن بنائے۔ جہاں نوجوان طلبہ وطالبات کے لئے بہترین ماحول میں بیٹھ کر کتاب بینی کے مواقع فراہم ہوسکیں۔

طلبہ وطالبات کو چاہئے کہ موسم گرما کی طویل چھٹیوں میں کتب بینی کو اپنا خاص معمول بنائیں اور گرمی کی لمبی دوپہروں کو گھنے درختوں کی گھنیری چھاؤں میں حافظ شیرازی کو یاد کرتے ہوئے ''فراغتے کتابے وگوشۂ چمنے ''، پر عمل پیرا ہو کر قوم وملک کی تعمیر وترقی کی منزل کی طرف گامزن ہوں۔

☆......☆......☆

جامعہ پشاور کا عظیم اجتماع

بدھ بتاریخ ۲۲ ستمبر جامعہ پشاور کے کانوکیشن ہال میں اس کے ملازمین [خاکروب تا پروفیسر] کا تقریباً تین گھنٹے پر محیط اجتماع کا انعقاد ہوا۔ میرے مشاہدے کے مطابق گذشتہ بیس برسوں میں جامعہ کی سطح پر اتنا بڑا اجتماع میں نے نہ دیکھا اور نہ سنا۔ ملک وقوم اور جامعۂ پشاور کی تاریخ میں گذشتہ دس بارہ برسوں میں کئی نشیب وفراز اور اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے اور اس حوالے سے جامعۂ پشاور اور کیمپس پر موجود دیگر جامعات کے اساتذۂ کرام اور ملازمین نے اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کئی حوالوں سے کیا۔ لیکن شدید حبس اور گرمی کے باوجود کانوکیشن ہال کا یہ اجتماع مثالی رہا۔ اس اجتماع کے انعقاد پر مجھے جہاں اس لحاظ سے خوشی ومسرت ہو رہی تھی کہ آج جامعہ پشاور اور کیمپس پر موجود دیگر تین جامعات کے ملازمین کے درمیان مناصب کے امتیاز کے بغیر ایک مثالی یگانگت، یکجہتی اور اتفاق واتحاد کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے جو معاشرے کے بیدار ترین اور حساس ترین شعبہ جات کی بیداری کا احساس دلا رہا تھا اور یہ بیداری سول سوسائٹی کے ذریعے معاشرے کے مسائل کے حل کے لئے ایک بہترین کردار ادا کرنے کے اشارے دے رہی ہے۔ اور اگر یہ احساس، جذبہ اور ردعمل اور اتحاد واتفاق اسی طرح جاری رہا تو کم از کم جامعات کی سطح پر قانون وضابطہ کی فرمان روائی کو استحکام وتسلسل نصیب ہوگا۔ لیکن جب آج کے اجتماع کی کیمسٹری کے بارے میں تجزیہ وتحلیل کی نظر سے تھوڑی سی توجہ کی تو پتہ چلا کہ اس اجتماع کی عظمت، جوش وخروش اور اتفاق واتحاد کے پیچھے جو عنصر کار فرما ہے وہ ہر ملازم کی جیب پر پڑنے والا ناخوشگوار اثر ہے۔ مان لیا کہ حق کا طلب کرنا اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن زندگی میں اور بھی تو فرائض وحقوق ہوتے ہیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ پیوٹا کے سابق صدر پروفیسر ارباب خان آفریدی مختلف ملی وقومی واقعات، حادثات اور معاملات ومسائل کے حل کے لئے جب جامعہ کے ملازمین کو اپنے جذبات کے اظہار کی دعوت دی تو ہمیشہ جواب بہت پتلا رہا۔ اس لحاظ سے تھوڑا سا افسوس اس لئے ہوا کہ جامعات میں تو ملک وقوم کا بہترین ذہن ہوتا ہے۔ قوموں کی تعمیر وتشکیل میں معمارانِ قوم [اساتذۂ کرام] کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا اچھا ہی ہوگا اگر ہم اس جتماع کو نظیر بنا کر تہہ دل سے ارادہ کرلیں کہ جامعہ کی سطح سے لے کر ملک وقوم کی سطح تک ہم پروفیسر کم از کم چھوٹے چھوٹے معاملات (Pity Issues) ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنا، مخالفت کرنا بلکہ بعض اوقات دشمنیاں پالنا چھوڑ کر مملکتِ خداداد کی نازک صورت حال کے

پیش نظر ایک تعمیری اور صحیح معنوں میں ایک معمارِ قوم کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کریں گے۔

یہ اجتماع اس لحاظ سے واقعی یادر ہے گا کہ اس میں چاروں جامعات کے منتخب نمائندوں نے ایک ایسے مسئلہ پر اپنے خیالات اور مطالبات کا اظہار کیا کہ جامعات کی تاریخ میں ملازمینِ جامعات کے ساتھ ناروا اور امتیازی اور ظلم پر مبنی سلوک کا ایک بہت ہی ناپسندیدہ مظہر ہے۔ جامعات کے ساتھ وزیر خزانہ اور وزیر تعلیم کے ''خصوصی سلوک'' کا اندازہ لگائیں کہ حکومت پاکستان کی پارلیمنٹ سے منظور شدہ بجٹ کی رو سے باقاعدہ جاری شدہ نوٹیفیکیشن اور اس کے باوجود کہ جامعات کے اساتذۂ کرام اور ملازمین کے علاوہ ملک کے سارے دیگر ملازمین کو تنخواہوں میں اعلان شدہ پچاس فیصد اضافہ دے دیا گیا ہے لیکن اگر بجٹ میں کٹوتی ہوتی ہے تو صرف شعبۂ تعلیم کے لئے۔ حالانکہ آج اکیسویں صدی میں تو عقل کا اندھا بھی اتنا تو سمجھتا ہے کہ اگر ملک کی جامعات اور اساتذۂ کرام کا ماحول آسودہ نہ رہا تو ملک وقوم کے مستقبل کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

ہم جامعات کے اساتذۂ کرام اس بات سے قطعاً بے خبر نہیں کہ ملک بہت سارے معاملات کے حوالے سے اور بالخصوص معاشی لحاظ سے بہت نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ نازک دور میں ملک وقوم کو سنبھالا دینے کے لئے اساتذۂ کرام ایک مثالی کردار ادا کرنے میں ہراول دستہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن اگر واقعی صورتحال اتنی ہی نازک ہے کہ اساتذہ اور ملازمین جامعات کو سات ارب روپے نہیں دیئے جاسکتے تو پھر تو آیئے بچت اور کفایت شعاری کی ایسی مہم شروع کردیں جس سے مملکت خداداد کا معاشی بیڑا پار لگے۔

کیا اس ہدف کے حصول کے لئے ضروری نہیں کہ سب سے پہلے حکمران طبقہ سے ابتدا کی جائے کیونکہ یہ طے شدہ ہے کہ عوام کی تقلید کے لئے بہترین مثال حکمران ہی ہوتے ہیں۔ اس غریب ملک کے وزراء کی تعداد سو کے قریب ہے۔ اس کا تقابل ذرا امریکہ بہادر اور بھارت کے ساتھ کیجئے، کیا وہاں اتنے بڑی وسیع اور بھاری انفراسٹرکچر کے حامل ممالک کے چلانے کے لئے کہیں تاریخ میں بھی سو وزراء کی فوج ظفر موج رہی ہے۔

شنید ہے کہ ہر وزیر کا روزانہ کا خرچہ لاکھوں میں ہے تو سو وزراء کا لاکھوں کا روزانہ خرچہ تو کروڑوں میں اور ماہانہ خرچ تو اربوں میں ہوگا۔ کیونکہ امراء وزراء کا یہ خرچ اور ان کے کیچن اور صحت اور خاندانوں پر اٹھنے والے اخراجات کو بھی ذرا قابو میں لایا جائے۔ اس کے لئے ان تمام محکموں کو جو ہماری نالائقیوں کی وجہ سے خسارے میں چل رہے ہیں اور قوم وملک کے لئے سفید ہاتھی بن کر تباہی کا سبب بن رہے ہیں، ان کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا

جائے۔ حساب کتاب کرنے سے اور بھی بہت سے شعبے اصلاح واحوال کے طلبگار ہیں۔ کیا جامعات کے فنڈ کی کٹوتی سے مملکتِ خداداد کے معاشی مسائل حل ہوجائیں گے۔ اگر واقعی کسی معاشی بقراط کا جواب ہاں میں ہے تو ہم اساتذہ وطنِ عزیز کی سلامتی، تحفظ اور بقا کے لئے تنخواہ تو کیا تن من دھن کی قربانی کے لئے کل بھی تیار تھے آج بھی تیار ہیں اور کل بھی تیار رہیں گے۔ اگر ایسی بات نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے کہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے مصداق سات ارب روپے حکومت کے لئے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے اور اس کے باوجود جامعات میں بے چینی اور انتشار پیدا کرنے کے اسباب پیدا کئے جارہے ہیں تو یقیناً ایسے لوگ اس حکومت کے لئے جو پہلے ہی بہت سارے گھمبیر بحرانوں میں گھری ہوئی ہے، مرے کو مارے شاہ مدار'' کے مصداق ثابت ہوں گے۔

اس کے اوپر یہ بات تو ستم بالائے ستم ہے کہ وزیر تعلیم اساتذۂ کرام پر یہ الزام بھی لگارہے ہیں کہ اساتذہ اپنی تنخواہوں میں اضافے کے لئے طلبہ وطالبات کو استعمال کررہے ہیں حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جامعات میں اساتذہ اور طلبہ وطالبات کے درمیان جو روحانی رشتہ ہوتا ہے وہ باپ اور اولاد کی حیثیت رکھتا ہے اگر کسی کے باپ کے ساتھ کوئی زیادتی، ظلم یا ناروا سلوک برت رہا ہے تو اولاد کا بے چین ہونا ایک لازمی اور بدیہی امر ہے۔ اساتذہ بے چین ہوں تو وہ کبھی بھی دلجمعی کے ساتھ نہیں پڑھا سکتے۔ اور پھر جب اساتذہ کلاس روم میں موجود ہی نہ ہوں تو طلبہ وطالبات وہاں کیا کریں گے؟

حکومت کے ان وزراء اور اہل کاروں سے جو مسائل کی گتھی عقل وہوش سے سلجھانے کے روادار ہیں، درخواست ہے کہ اس معمولی مسئلے کو مسئلہ نہ بننے دیں۔ جامعات کے اساتذہ اسی قوم کے اساتذہ ہیں لہٰذا ان کو مطمئن کرنے کے اسباب ڈھونڈنے میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے ورنہ بہت نقصان ہونے کے خدشات موجود ہیں۔ کل ایک دن میں اس بدقسمت ملک وقوم کے ہزاروں گھنٹے ضائع ہوئے ہیں۔ مزید قیمتی وقت کو ضائع ہونے سے بچایا جائے کہ ابھی کل ہی تو جامعات موسم گرما کی طویل چھٹیوں کے بعد کھلی ہیں۔ ورنہ پھر نہ کہنا، ہمیں خبر نہ ہوئی۔ جو ضروری کام دیر یا نقصان کے بعد کئے جاتے ہیں، دانا لوگ اس کو ''بعد از خرابی بسیار'' کے مصداق ہی سمجھتے ہیں۔

☆......☆......☆

جامعات، قومی یکجہتی اور پیوٹا کے انتخابات

کسی ملک وقوم کی ترقی وعروج میں اساتذہ اور تعلیمی اداروں کی اہمیت وکردار سے ہر صاحب نظر بخوبی واقف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ اقوام ترقی کی دوڑ میں سرفہرست ہیں جن کی قومی بجٹ کا ایک معتدبہ حصہ تعلیم وتعلم، اساتذۂ کرام اور طلبہ وطالبات کی فلاح وبہبود کے لئے وقف ہو۔ پاکستان میں چونکہ آج تک شعبۂ تعلیم کو وہ اہمیت کبھی نہیں دی گئی جو قیام پاکستان کے بعد دینا ضروری تھا۔ حق بات کہیں تو پاکستان میں تو تعلیم وتعلم کے ساتھ مذاق کیا گیا۔ وطنِ عزیز میں وزارت تعلیم کبھی بھی پسندیدہ ومحبوب ومطلوب وزارت نہیں رہی۔ اسی وجہ سے سارے فوٹ فولیو تقسیم ہونے کے بعد ہی تعلیم کی باری آتی ہے۔ خدا خدا کرکے .5% سے اب کہیں جاکر بجٹ کا 1.75% تعلیم کے لئے وقف ہو چکا تھا اور کچھ کچھ امید بندھ چلی تھی کہ شاید ملک تعلیمی میدان میں ٹیک آف کی پوزیشن میں آجائے لیکن ایک دفعہ پھر ملکی، معاشی حالات کی بناء پر جامعات کے بجٹ پر جو کٹ لگایا گیا ہے اس پر پورے ملک کی جامعات کی ذمہ داران سراپا احتجاج وپریشان ہیں۔

ہمارے ہاں تعلیم کے نام پر جو تجربات کئے گئے شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ہوئے ہوں۔ یہ بات تو ایک الگ تحقیقی وتجزیاتی مضمون کا متقاضی ہے کہ کسی پاکستان جیسے نظریاتی ملک میں بیسیوں قسم کے تعلیمی نصاب اور نظامہائے تعلیم کی اجازت کیوں اور کیسے دی گئی حالانکہ پاکستان کی یکجہتی، سالمیت اور ترقی کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسا نظام تعلیم وضع کیا جاتا جو مملکتِ خداداد کے اہداف ومقاصد کی تکمیل میں بنیادی کردار ادا کرتا۔ ہمیں ایک ایسے نظام تعلیم کی ضرورت تھی جو پاکستان کی ان اکائیوں کو جو قیام پاکستان سے پہلے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان وغیرہ کی صورت میں بکھری ومنتشر پڑی تھیں ایک لڑی میں پروتے ہوئے پاکستانی قومیت میں ڈھالتی۔ لیکن چونکہ قیام پاکستان کے بعد نئی نسل کی تعلیم وتربیت، تہذیب وترتیب کے لئے ایسا کوئی تردد درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان کے نظام تعلیم میں باہر سے بھی پیوندکاری کی گئی جس نے نہ صرف ہمارے قومی ہدف کو ہماری آنکھوں سے اوجھل کردیا بلکہ قوم کو اتنے طبقات میں تقسیم کیا کہ ہندوؤں کے ذات پات کی تقسیم سے بھی آگے نکل گئے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ملک ایک ہے اور اس میں نصاب تعلیم الگ الگ ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان کے یکجہتی اور اتحاد کے لئے کوئی قومی زبان،

قومی شاعر، قومی رہنما، قومی کھیل اور معلوم نہیں اور کیا کیا پر آج تک اتفاق نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے صرف چوبیس سال بعد ملک قومیت کی بناء پر دولخت ہوا۔ چونکہ پاکستانی قومیت مضبوط نہ تھی لہٰذا بنگالیوں نے ملی قومیت کو اہمیت ہی نہیں دی۔

قومی و نسلی تعصّبات کو صرف اور صرف اسلام ہی ختم کر سکتا ہے ورنہ صحابہ کرامؓ کی تاریخ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام سے پہلے وہاں اس لحاظ سے کیا صورت حال تھی اور پھر اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے بعد کس طرح ایک مضبوط مسلمان امت وجود میں آئی۔ پھر جب مسلمانوں کی وہ بنیاد جس پر مسلم قوم کی تعمیر استوار ہوتی ہے، کمزور ہونا شروع ہوئی تو ہم افغانیوں، تورانیوں، ایرانیوں اور عربوں میں بٹ کر رہ گئے۔

آج پاکستان میں بھی یہی صورتحال ہے کہ سب کچھ موجود ہے لیکن اگر کہیں نظر نہیں آتا تو وہ پاکستانی قومیت ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بڑی وجہ ہمارا نظریہ و نصاب تعلیم ہے۔ پاکستانیت کا پیدا ہونا اور پروان چڑھنا تو بہت بڑی بات ہے، اب تو بات یہاں تک پہنچی ہے کہ ہر صوبے میں علاقائی بنیادوں پر تعصّبات برتے جاتے ہیں۔

گذشتہ حکومت کے مجسٹریسی نظام کی جگہ لوکل گورنمنٹ کے نظام نے اور بھی گل کھلائے کہ لوگوں کو ضلعوں میں تقسیم کر دیا۔ قومی و ملی اتحاد پر بات کرتے کرتے میں بہت دور نکل گیا اور میں اس سلسلے میں عرض یہ کر رہا تھا کہ دراصل نظامِ تعلیم ہی وہ اوزار ہے جس کے ذریعے قوموں کو قومی اہداف کی طرف گامزن کیا جاتا ہے۔ پھر کسی بھی ملک و قوم کے لئے جامعات [یونیورسٹیاں] اور دیگر تعلیم ادارے وہ مراکز ہوتے ہیں جہاں ملک و قوم کی ٹاپ براس جمع ہوتی ہے اور یہی لوگ اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے آئندہ نسلوں کی تعلیم و تربیت کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔

ترقی یافتہ ملکوں میں تو جامعات کے اساتذہ نہ صرف پڑھاتے ہیں بلکہ اپنی حکومتوں کے لئے تھینک ٹینک کا کام کرتے ہوئے ملک و قوم کی سلامتی و یکجہتی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان میں نہ حکومت نے کبھی اپنے جامعات کے اساتذۂ کرام کو یہ کردار سونپا اور نہ ہی اساتذہ نے الا ماشاء اللہ وہ کردار نبھانے کی بھرپور کوشش کی ہے جو ایک استاد کی حیثیت سے ان کے ذمے تھا۔ ہماری ہاں عام طور پر حکومت اساتذہ سے اور اساتذہ حکومتوں سے سرگرداں رہتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کمی شکایت

وفا دونوں طرف سے رہتی ہے۔ لیکن خدا لگتی بات یہ ہے کہ وفاداری بشرط استواری کی زیادہ ذمہ داری اساتذۂ کرام پر اس لئے آتی ہے کہ استاد کے معنیٰ و تعریف ہی یہ ہے کہ وہ معاشروں اور حکومت سے کچھ مانگے بغیر اپنا فرض ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ پیغمبری پیشہ ہے اور انبیاء و پیغمبروں نے قوم و ملت کی تعلیم و تزکیہ کا کبھی معاوضہ طلب نہیں کیا ہے بلکہ وہ تو ہمیشہ کہتے ہیں کہ ''میرا اجر تو اللہ کے ذمے ہے''۔

آج جبکہ پاکستان مشکلات میں گھرا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ وطنِ عزیز کے جامعات کے اساتذہ بالخصوص اور دیگر تعلیمی اداروں کے اساتذہ بالعموم ملک کی یکجہتی اور اتحاد و اتفاق کے لئے اپنا بھرپور کردار ادا کریں، اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم سب پوری دیانتداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے ملک و قوم کے نوجوانوں کی اذہان میں وطنِ عزیز کی محبت اور اس کے لئے پورے پاکستان کے اساتذہ اور طلبہ و طالبات کے درمیان دینی اور ملکی بنیادوں پر الگ ہونے کا پیغام عام کرنا ہوگا۔

اس بات کے لئے بڑی ذمہ داری ہماری سیاسی جماعتوں پر بھی پڑتی ہے کہ وہ طلبہ طالبات کے حوالے سے تقسیم در تقسیم کو رد کرتے ہوئے پاکستان کے سارے جامعات کے طلبہ و طالبات کو صرف طلبہ ہی سمجھ کر بات کریں۔ سیاسی اور نظریاتی بنیادوں پر بعض کو اپنا سمجھنا اور دیگر کو غیر سمجھنا ملک و قوم کے اتحاد و سلامتی کے لئے کسی طور پر مفید نہیں ہوسکتا۔ اس بات کی بھی سب سے زیادہ ذمہ داری حکومتی ایوانوں پر آتی ہے کہ وہ پاکستان کے سارے طلبہ و طالبات کو نظریاتی الحاق سے قطع نظر قوم و ملک کے آئندہ نسلوں کے طور پر دیکھنا ہوگا۔ اس سے نہ صرف ملک میں جاری مشکلات کو ختم کرنے کے لئے ہمیں ایک متحد، مضبوط و توانا نسل میسر آئیگی بلکہ سیاسی جماعتوں کے درمیان بھی خوشگوار تعلقات پروان چڑھیں گے۔ جس سے ملک و قوم کی مضبوطی کے ساتھ ساتھ ترقی کی راہیں بھی ہموار ہوں گی۔

چونکہ آج تک ہمارے ہاں سیاست کی بنیاد ہی اختلافات بلکہ بعض اوقات دشمنی کی حد تک پہنچنے والے تنازعات پر استوار ہو چکی ہے جس کے اثرات ملک و قوم کے ہر شعبۂ زندگی پر پڑنا بدیہی سی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں ملک کی سیاسی جماعتوں کے اثرات ہماری جامعات پر بھی پڑتی رہی ہیں۔

پشاور یونیورسٹی ہمارے صوبہ کی سب سے بڑی اور قدیم یونیورسٹی ہے۔ اس میں گذشتہ چالیس برسوں سے اساتذہ کے درمیان انتخابات ہوتے رہے ہیں اور یہ بات ہر ایک کو معلوم ہے کہ جامعۂ پشاور میں تین اہم

مکاتبِ فکر کے لوگ آپس میں انتخابات کے دوران مدِ مقابل رہے ہیں۔ پشاور یونیورسٹی کے انتخابات کے نتیجے میں ہمارے ملکی سیاست کی طرح گذشتہ کئی برسوں کے دوران یونیورسٹی میں اساتذہ کے درمیان سیاسی اور بعض اوقات مفاداتی تلخیاں اتنی بڑھتی رہی ہیں کہ پروفیسرز ہوتے ہوئے آمنے سامنے آتے وقت ایک دوسرے سے منہ پھیر لیتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورتحال پر میں اپنے آپ شرمندہ ہوجاتا کہ یارب، ملک وقوم کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے افراد کے درمیان نقطۂ نظر کے اختلافات یہاں تک بھی بڑھ سکتے ہیں، پھر میں دل ہی دل میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتا کہ پروردگار، اس خوبصورت جامعہ اوراس کے اہم ترین افراد پر اپنا فضل وکرم فرما کہ ان کے درمیان اخوت کی الفت پیدا ہو۔

الحمدللہ! کہ مجھے اس دعا کی قبولیت کے آثار اس وقت نظر آنے لگے جب ۱۶ اکتوبر کو پیوٹا [پشاور یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن] کے جنرل باڈی میٹنگ میں یونیورسٹی کے اساتذۂ کرام نے ببانگِ دھل اعلان کیا کہ ہم سب ملکی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے سیاسی اختلافات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ایک ہونے کا عزمِ صمیم کرتے ہیں۔ اس بات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے سٹیج سے تو یہاں تک بات ہوئی کہ پیوٹا کے آئندہ الیکشن میں ذمہ داران کے انتخابات کی بجائے ٹاس کے ذریعے قرع نکالا جائے تاکہ وہ یونیورسٹی کے سارے اساتذہ کی نمائندگی کرکے اختلافات کو بیخ وبُن سے اکھاڑ ملک وقوم کے سیاستدانوں کو بھی ایک تھینک ٹینک کی حیثیت سے ملکی مفادات وسلامتی کے لئے کے لئے ایک روشن علامت کے طور پر پیش کرسکیں۔

جامعہ پشاور کے اساتذۂ کرام کا یہ اقدام ملکی حالات کے اس موڑ پر بہت قابلِ ستائش ہے لیکن مجھے ذاتی طور پر اس سے اختلاف ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ کے صدر اور سیکریٹری کا انتخاب ''منجور ونا منجور'' کے ذریعے تو کم از کم نہیں ہونا چاہئے۔ البتہ اتفاق ویکجہتی کے فضاء کو پروان چڑھانے کے لئے ایک کمیٹی کے ذریعے مناسب وموزوں اور یونیورسٹی کی خدمت کے لئے ہمہ تن تیار تینوں گروپوں کی نمائندگی کے حامل افراد کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے فکر وعمل کے ذریعے ملک وقوم اور نوجوان نسل کو رہنمائی فراہم کرسکیں۔

جامعہ پشاور میں ایک خوشگوار اور تعلیمی وتحقیقی ماحول کے پیدا کرنے کے لئے اس وقت بہت زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے لئے ایک اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر ایک بڑا احسان یہ کیا ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر عظمت حیات صاحب کے وائس چانسلر ہونے کی وجہ سے پشاور یونیورسٹی میں بڑے عرصے بعد ایک ایسی

شخصیت میسر آئی ہے جس پر کم وبیش سارے اساتذۂ کرام نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ آپ کے تشخص، علم وتحقیق سے شغف اور دیانتداری وامانتداری نے وہ ماحول پیدا کرنے کے لئے بنیادیں ہموار کرنا شروع کر دی ہیں جو ملک وقوم کے اتحاد واتفاق کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

لہٰذا پشاور یونیورسٹی کے اساتذۂ کرام ملکی تاریخ کے اس اہم موڑ پر اپنا شاندار فریضہ ادا کرتے ہوئے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر اپنے ذاتی اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نومبر کے انتخابات اور اپنے دیگر علمی سرگرمیوں کے ذریعے وہ مواقع پیدا کریں جو یونیورسٹی کے ساتذہ کے شایانِ شان ہوں۔ اس اہم فکر وعمل کے لئے کام کرنے والے یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں اور اس سلسلے میں پیوٹا کے موجودہ صدر محترم ارباب آفریدی کا ذکر نہ کرنا یقیناً ناسپاسی ہوگی۔ محترم ارباب آفریدی اس کے لئے اب بھی بہترین کوشش کر سکتے ہیں اور امید ہے کہ وہ اساتذۂ کرام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کے لئے اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ وما علینا إلا البلاغ

☆......☆......☆

مسلم زبانوں کا عربی حروفِ تہجی کی طرف واپسی ایک اہم تقاضا

دنیا کے ستاون [۵۷] مسلم ممالک میں سے تئیس [۲۳] عربی ممالک کے علاوہ تقریباً پینتیس [۳۵] مسلم ممالک میں سے پاکستان، ایران، افغانستان اور چین کے صوبہ سنکیانگ [کاشغر] کی زبانوں کا رسم الخط اور حروفِ تہجی عربی زبان پر مشتمل ہیں۔ باقی مسلمان ممالک میں رومن، ہندی یا ان کی مقامی کسی زبان کا رسم الخط رائج ہے۔ مسلم ممالک میں قرآن وحدیث پر مبنی علوم کی اہمیت، فضیلت اور افادیت سے ہر باشعور انسان بخوبی واقف ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زندگی کے بہت سارے دیگر اہم امور کی طرح مسلم ممالک میں تعلیم، اس کی اہمیت اور اس حوالے سے ذریعۂ تعلیم کے بارے میں بھی اس روایتی سستی، غفلت اور ناعاقبت اندیشی کی ایک دبیز چادر تنی ہوئی ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زبانیں سب اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ کوئی زبان بذاتہٖ بری نہیں ہے اور سب زبانیں اللہ کی طرف سے ہونے کی بناء پر بنیادی طور پر اچھی ہیں۔ جب تک ہم انسان اس کو غلط طور پر استعمال نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں دنیا میں زبانوں کے اختلاف کو اللہ کی نشانیوں [آیات] میں سے ایک نشانی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانانِ عالم کے لئے دنیا کی ساری زبانوں میں سے زیادہ اہم اور افضل زبان عربی ہے۔ کیونکہ یہ کلام پاک اور احادیث مبارکہ کی زبان ہے۔ عربی میں قرآن کریم ہی انسانیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا آخری، کامل اور جامع مکالمہ ہے۔ اور یہی انسانیت کی رشد وہدایت کے لئے مستند اور مقدس ذریعہ ہے۔ لہٰذا جب تک عربی زبان میں مہارت پیدا نہ کی جائے تب تک علوم اور ہدایت کی ان بنیادی مصادر سے کماحقہٗ استفادہ کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جاتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ عجمی ممالک میں قرآن وحدیث کا مقامی زبانوں میں ترجمہ ہوتا ہے لیکن تلاوتِ کلام مجید کے لئے عربی زبان سیکھنا لازمی ہے۔ ہم مسلمان اس لحاظ سے کتنے بدقسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ہمارے نام آخری پیغام پڑھنے کی ماڑی ماٹی کوشش تو کہیں ۵ فیصد لوگ کر لیتے ہیں لیکن دنیا کی یہ نادر قوم ہم ہی ہیں کہ کتاب اللہ کو پڑھ سکتے ہیں، سمجھ نہیں سکتے۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ عربی زبان کو عجمی مسلم ممالک میں وہ اہمیت نہ ملی جس کی وہ کلام اللہ کی زبان ہونے کی بناء پر مستحق تھی۔

یہ المناک داستان تو ایک طرف کہ ہم عربی زبان کو اپنے نصاب میں اس کا جائز مقام نہ دلا سکے، بعض اہم ممالک جیسے ترکی، بنگلہ دیش وغیرہ میں استعمار نے بہت شاطرانہ انداز میں اپنے ایجنٹوں کے ذریعے وہاں کی عربی رسم الخط کو بھی تبدیل کرایا تاکہ عربی زبان میں صدیوں سے چلا آرہا علمی ورثہ نئی نسل کی رسائی سے دور ہو جائے۔ اس عمل نے بہت بڑا نقصان کیا۔ اگر عربی زبان کو سارے عجمی مسلم ممالک میں نصاب میں شامل کیا جاتا تو قرآن و حدیث کو سمجھنے میں آسانی ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان ممالک میں عربی و عجمی کی تقسیم ختم ہو جاتی اور امتِ مسلمہ کے درمیان اخوت و مودت کے رشتے مضبوط ہو پاتے۔

کالم کی تنگ دامنی کی بناء پر میں زبانوں کی تاریخ، اہمیت و افادیت پر اس وقت بات کرنے سے قاصر ہوں ورنہ بہت دلچسپ بحث ہے کہ زبان اقوام کی پہچان اور ترقی کے لئے ایک بنیادی ذریعہ ہوتی ہے۔ اقوام کی ترقی کے ساتھ ان کی زبان اور تہذیب و تمدن بھی لوگوں میں مقبول ہوتی جاتی ہے۔ ہسپانیہ پر مسلم حکومت کے دوران یورپ سے لوگ عربی زبان اور علوم سیکھنے کے لئے اندلس میں اس طرح آیا کرتے تھے جیسے ہم آج کل امریکہ اور یورپ میں حصولِ علم کو مستند اور باعث معیار سمجھتے ہیں۔

یہ باتیں تو تاریخ کا حصہ ہیں۔ ہمیں اب آج کی بات کرنی چاہئے اور وہ یہ کہ مسلم ممالک کے وزرائے تعلیم اس بات پر غور و فکر کے لئے وقت نکالیں کہ اب بھی وقت ہے کہ عربی زبان کو عجمی مسلم ممالک میں اس طرح سے رائج کیا جائے کہ انگریزی کے برابر درجہ دیا جائے۔ اس بات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہندوستان، چین، جاپان اور یورپ کے کئی اہم ممالک میں عربی زبان کو آج کی معیشت کی زبان کے طور پر اپنانے کے منصوبے بنا کر خلیجی ممالک میں اپنی افرادی قوت کی کھپت کے علاوہ اپنی مصنوعات کے ذریعے منڈیوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ سفارتی دنیا میں بھی غیر مسلم ممالک کے سفرائے کرام عربی زبان سیکھ کر اہم کردار ادا کرتے ہیں جبکہ عجمی مسلم ممالک میں الا ماشاء اللہ والی صورت حال ہے۔ شیخ زاید اسلامک سنٹر، پشاور یونیورسٹی میں ۲۷ جنوری کو عربی زبان کی اہمیت اور مسلمان ممالک میں عربی رسم الخط اور عربی زبان کو نصاب ہائے تعلیم میں شامل کر کے اتحاد امت کے علاوہ اقتصادی میدان میں آگے بڑھنے کے لئے ایک اہم ذریعہ کے طور پر استعمال کے احساس کو اجاگر کرنے کے لئے ایک سیمینار منعقد ہوا جس کے روحِ رواں میجر [ریٹائرڈ] طارق محمود اور

ڈائریکٹر شیخ زاید اسلامک سنٹر، پشاور یونیورسٹی دوست محمد خان کے علاوہ شعبۂ عربی وسیرت کے چیئرمین حضرات کے علاوہ اساتذہ اور طلبہ وطالبات کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کر کے اس اہم منصوبے کو پروان چڑھانے کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔

اس سیمینار میں مؤرِّخہ پروفیسر ڈاکٹر لعل بہا نے شرکت کر کے زبانوں کی اہمیت پر پُرمغز باتیں کیں۔ امید ہے کہ اس فورم کے ذریعے عربی زبان کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی مہم آگے بڑھے گی۔

☆......☆......☆

پاکستان کے تعلیمی ادارے اور ہمارا مستقبل

اِس بات میں دوسری رائے ہو نہیں سکتی کہ کسی بھی معاشرے اور ملک کی ترقی کیلئے تعلیم و تعلم بنیادی ضرورت ہے۔ آج دُنیا میں جتنے بھی ترقی یافتہ ممالک نظر آتے ہیں اُنہوں نے ایک عمر تعلیم کے حصول میں لگائی ہے اور اپنے بجٹ کا ایک وقیع حصہ اس مد میں لگایا ہے۔ تب جا کر کہیں امریکہ اپنی تاریخی خانہ جنگی سے نکل دُنیا کی سپر پاور بننے کی راہ پر چل پڑا تھا۔ جاپان اور جرمنی کی مثالیں بھی دُنیا کے سامنے ہیں کہ دو بڑی جنگوں نے اُن کے انفراسٹرکچر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا تھا لیکن تعلیم کی برکت سے آج پوری دُنیا اُن کی معترف ہے، لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ باسٹھ برس بعد بھی ہم اُس راستے پر اپنا سفر شروع ہی نہیں کر سکے ہیں جو ترقی کی طرف جاتا ہے۔

ماہرین تعلیم کے مطابق تعلیم کے ذریعے ملکی ترقی کیلئے بہترین لوگ پیدا کرنے کیلئے پرائمری تعلیم ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کی حامل ہوتی ہے لیکن وطنِ عزیز میں آپ پرائمری سکولوں کا حال تو ذرا دیکھئے۔ تعلیم کے حصول کیلئے سب سے پہلی ضرورت مناسب جگہ، ماحول اور عمارت کی ہوتی ہے۔ آپ پاکستان میں پرائمری سکولوں کا معائنہ کرتے چلے جائیں، بہت کم سکول ایسے ہوں گے جہاں بچے اور بچیاں اور اساتذہ اطمینان کے ساتھ پڑھ پڑھا سکتے ہیں۔ پرائمری سکولوں کی اکثر عمارتیں ٹھیکیداروں کے کمیشن مافیا کے سبب مخدوش حالت میں کھڑی ہوتی ہیں، حکومت کے خزانے سے سکولوں کی تعمیر و مرمت کیے لئے کروڑوں روپے کاغذوں میں خرچ کر کے دکھائے جاتے ہیں لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ محکمہ تعلیم کے دفاتر کی کالی بھیڑیں اِن رقوم کا ایک بڑا حصہ بہت مہارت کے ساتھ کھا لیتی ہیں، جس کا نتیجہ بعض اوقات عمارتوں کے انہدام کی صورت میں معصوم جانوں کی ضیاع کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کے علاوہ پرائمری سکولوں میں پڑھانے کیلئے جو اساتذہ کرام دستیاب ہیں اُن میں سے بہت کم نے پیشۂ معلّمی کو اپنی مرضی سے اختیار کیا ہے۔ زیادہ تر لوگ کوئی اور پیشہ نہ ملنے کی بناء پر مجبور ہو کر پی ٹی سی جس کو میرا ایک ستم ظریف دوست "پاکستان تباہ کن کمپنی" کے نام سے پکارتا ہے، کر کے پاکستان کی معصوم نسلوں کو علم کے نام پر جہالت بانٹتے ہیں۔ کچھ استثنیٰ کے ساتھ زیادہ تر پرائمری اساتذہ تعلیمی لحاظ سے نااہلیت کی بناء پر اور کچھ

معاشرتی، اقتصادی اور سماجی مجبوریوں کی وجہ سے اپنا فریضہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

بہت سارے سکولوں میں پینے کا صاف پانی اور حمام وغیرہ صحت کے اصولوں سے کوسوں دور ہیں۔ بجلی کا تو رونا کیا، کہ وہ تو ایک عام وبا کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ آپ سروے کر کے دیکھ لیں کہ ہمارے سکولوں میں کتنے اساتذۂ کرام مستقبل کے قومی معماروں کے اخلاقیات کی تعمیر پر کوئی توجہ مبذول کئے رکھتے ہیں یا اُن کے دِل میں اِس حوالے سے کوئی جلن کڑھن، یا خواہش وغیرہ موجود ہے۔

دوسری طرف اساتذہ کی بے چینی، بے قراری اور عدم اطمینان اِس حوالے سے بھی دیدنی ہوتی ہے کہ اُن کی تنخواہوں میں پانچ چھ افراد پر مشتمل خاندان کی کفالت کی سکت بھی نہیں پائی جاتی۔ جس کی بناء پر اساتذہ کی اکثریت کوئی اضافی و بالائی آمدنی کے چکر میں کولہو کا بیل بننے پر مجبور ہوتے ہیں۔

پرائمری تعلیم کی اہمیت کا انداز اِس سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں تعلیم کی خشتِ اوّل رکھی جاتی ہے۔ اگر وہ ٹیڑھی رکھی گئی اور پاکستان میں عموماً ہی وہ ٹیڑھی رکھ دی جاتی ہے کہ سیدھی اور مضبوط خشت رکھنے کیلئے ماہر معمار کی ضرورت ہے، تو ثریّا تک ہماری دیواریں کج ہی اُٹھالی جاتی ہیں۔ بلکہ اُن اینٹوں پر تو کجی دیواریں بھی بعض اوقات اُٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر اِس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ پرائمری سکولوں سے بہت کم طلبہ ثانوی سکولوں کی طرف منتقل ہونے کے اہل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے پاکستان میں طلبہ کی ایک کثیر تعداد پرائمری کی سطح پر ہی تعلیم وغیرہ کو خیر باد کہہ دیتی ہے۔ پھر لشٹم پشٹم جو طلباء ثانوی سکولوں میں چلے جاتے ہیں وہاں بھی سکولوں کے انفراسٹرکچر، اساتذہ، اور خاص کر سائنسی مضامین کے ماہر اساتذہ اور لیبارٹریوں کی کمی کی بناء پر طلباء کی وہ بنیادیں کمزور رہ جاتی ہیں جن پر کھڑے ہو کر وہ کالج کی سطح پر سائنسی یا سماجی علوم کی سنجیدہ معیار تک پہنچنے کیلئے ضروری ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ثانوی سطح کی تعلیم ہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جہاں پر بچوں کے مستقبل کے حوالے سے والدین، اساتذہ اور بچے کی باہمی مشاورت سے فیصلہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں خیر سے ساٹھ فیصد سے زیادہ والدین تو ان پڑھ یا نیم ان پڑھ ہونے کے سبب اس قابل ہی نہیں ہوتے کہ اپنی اولاد کی اِس سلسلے میں رھنمائی کریں، البتہ لوگوں سے سُن سنا کر اپنے بچوں کو سائنس کے مضامین کی ترغیب دے دیتے ہیں تا کہ ڈاکٹر بنیں یا انجنیئر ۔ اِس سلسلے میں بچوں کے رجحان معلوم کرنے یا اُن کی صحیح سمت میں رھنمائی کیلئے اکثر اساتذہ بھی نہ کوئی تردد کرتے ہیں اور نہ ہمارے سکولوں میں ایسا کوئی نظام یا معیار

پایا جاتا ہے جس کے ذریعے یہ اہم کام سرانجام دیا جائے۔ لہٰذا ایسے لڑکے بھی سائنس کے مضامین اختیار کر لیتے ہیں جنہیں سرے سے سائنسی معلومات یا علم سے کوئی رغبت ہی نہیں ہوتی۔ نتیجۃً یا تو میٹرک میں فیل ہو جاتے ہیں یا پھر مضامین تبدیل کر کے آرٹس کے مضامین کے ساتھ میٹرک پاس کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں بعض تو کامیاب ہو کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے میٹرک کی سند لے کر کہیں چپڑاسی، چوکیدار وغیرہ کی نوکری کی تلاش شروع کر دیتے ہیں اور بعض ناکام ہو کر سلسلۂ تعلیم ہی منقطع کر کے فرار کی راہ اختیار کر لیتے ہیں، اِس طرح اِس قسم کے طلبہ نہ دین کے نہ دُنیا کے کام آتے ہیں۔

ترقی یافتہ ممالک میں میٹرک کی سطح پر ہی طلبہ کے حوالے سے یہ فیصلہ کر لیا جاتا ہے کہ طلبہ کا یہ گروپ آرٹس میں جا کر نام کمائے گا دوسرا گروپ جو سائنس میں دلچسپی کا حامل قرار دیا جاتا ہے اُس کو سائنسی میدان میں تخصص حاصل کرنے کی راہ پر ڈال دیا جاتا ہے۔ البتہ جو نہ آرٹس اور نہ سائنس کی صلاحیت رکھتے ہیں اُن کو میٹرک کے بعد فنی علوم (Technology) کی راہ پر ڈال کر اپنے ملک اور دیگر ممالک میں روزگار کے حصول کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں اگر میٹرک کی سطح پر اِس نظام کو متعارف کرایا جائے تو ووکیشنل کالجز کے ذریعے ایسی افرادی قوت تیار کی جا سکتی ہے جو نہ صرف عرب ممالک سے وطنِ عزیز کیلئے کثیر زرِ مبادلہ کمانے میں مدد و معاون ثابت ہو سکتی ہے بلکہ خود اپنی اور اپنے خاندان اور علاقے کی معیشت بہتر بنانے میں کردار ادا کر سکتی ہے۔

لیکن افسوس ہی کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں اگر حکومت اور معاشرے کی توجہ حاصل نہیں کی جا سکی تو وہ صرف تعلیم کا شعبہ ہے۔ زبانی کلامی تو ہم سب علم کے عاشق اور خوب رسیا ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی قوم کی مذکورہ بالا صورتِ حال کے پیشِ نظر دِل ماننے کو تیار ہی نہیں ہوتا کہ تعلیم و تربیت سے ہمارا بحیثیت قوم کوئی دور کا تعلق اور نسبت بھی ہے۔

ہمارے تعلیمی اداروں میں والدین، اساتذہ اور حکومت کی عدم دلچسپی کے باعث مجموعی اور قومی سطح پر اِس کے کیا اثرات سامنے آ رہے ہیں۔ اِس پر اگلے کالم میں بات ہوگی۔

☆......☆......☆

پاکستان کے تعلیمی ادارے اور ہمارا مستقبل [۲]

تعلیم کا اوّل و آخر مقصد یہ ہے کہ انسان تاریکی سے روشنی میں آجائے۔ اس لئے علم کو نور اور لاعلمی کو جہالت یا اندھیرے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں عالم اور بے علم کے درمیان پہچان اور تمیز کیلئے کئی مقامات پر مختلف پیرایوں میں یہ بات بیان فرمائی ہے کہ تعلیم یافتہ اور ان پڑھ ایک جیسے نہیں ہو سکتے یعنی پڑھے لکھے لوگ ان پڑھوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح اِس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں گذشتہ ساٹھ سال کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں یا آج کسی "تعلیم یافتہ" اور ایک دیہاتی کا تقابل کرالیں، ان پڑھ دیہاتی اخلاقیات، سوچ وفکر اور ملک وقوم کی خدمت کے حوالے سے اِس معنیٰ میں بہتر ہوگا کہ آج تک کسی ان پڑھ نے ملک وقوم کو کرپشن یا سالمیت وطن کے حوالے سے کبھی کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے جس پر قوم کو شرمندہ ہونا پڑے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ 4800 این آر او زدگان میں کوئی ایک ان پڑھ بھی شامل نہیں۔

اِس صورت حال کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں پڑھانے لکھانے کا تھوڑا بہت انتظام تو ہو جاتا ہے لیکن اخلاقی تربیت کو تو تعلیم کا حصہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ جس کی وجہ سے لوگ اپنے مضمون میں تو شاید کچھ شد بد حاصل کر لیتے ہیں لیکن تعلیم کے ساتھ امانت، دیانت اور شرافت کا کوئی سبق کم حاصل ہوتا ہے۔

اِس ناقص نظامِ تعلیم اور دیانت دار و پروفیشنل اساتذہ نہ ہونے کی بناء پر معاشرے کو ایسے افراد شاذ و نادر ہی ملتے ہیں جو اپنی ذات اور مفادات سے بُلند ہو کر کہیں دوسروں کیلئے بھی سوچ سکے۔ دُنیا میں جہاں کہیں آپ کسی معاشرے کو دیکھیں گے اُس کی اچھائی اور برائی کا اندازہ وہاں کے نظامِ تعلیم، نصاب، اساتذہ اور تعلیم کیلئے ملکی سطح پر مختص بجٹ سے بخوبی اور آسانی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ کیونکہ سارے معاشرے ہر دور میں اُس کے اساتذہ کی مصوری کے عکاس ہوتے ہیں۔

یونان کو تاریخ میں جو مقام حاصل ہے وہ افلاطون، سقراط اور ارسطو جیسے اساتذہ کی مرہون منت ہے۔ برطانیہ امریکہ اور مغرب کی ترقی نام نہاد ہی صحیح، اُن کے پیمانے پر پورا اُترنے والی ایک معیاری تہذیب وتمدن اور طرزِ حکمرانی وغیرہ وہاں کے اُن اساتذہ کے سر ہے جنہوں نے تعلیم کو ایک سنجیدہ موضوع بلکہ موت وحیات

اور بقائے قوم کے مسئلے کے طور پر لیا۔

ہمارے ہاں گذشتہ ساٹھ برسوں سے یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ پاکستان کی یکجہتی اور استحکام کے لئے پورے پاکستان میں ایک نظام تعلیم اور ایک ہی نصاب کتنا ضروری ہے۔ وطنِ عزیز کے چاروں صوبوں میں چار سو سے زیادہ نصاب مختلف زبانوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اِس پر مستزاد افواج و بحریہ و فضائیہ کے الگ سکول کالج، پرائیوٹ سیکٹرز میں نصاب و زبان و مقاصد اور صوبائی سطح پر ایک ہی سرکار کے تحت اختلاف اِس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہم نے ابھی تک ملک و قوم کیلئے تعلیم کے حوالے سے کوئی ٹھوس منصوبہ بندی کا سوچا بھی نہیں ہے۔

ہمارے ہائی سکول کی سطح پر ایک بڑی خرابی جو ہمارے نظامِ تعلیم کو بری طرح متاثر کررہی ہے یہ ہے کہ ہم شرح خواندگی بڑھانے کی غرض سے میٹرک کی سطح پر پرائیوٹ طور پر بھی امتحان کا ایک سسٹم رائج کئے ہوئے ہیں۔ پرائیوٹ طور پر امتحانات میں شامل ہونے والے امیدواروں کی اکثریت نقل، دھونس دھاندلی، سفارش اور دیگر ناجائز ذرائع کے استعمال سے ذرا بھی نہیں چوکتے۔ اِس کا اثر ہمارے باقاعدہ طلبہ و طالبات پر بھی پڑا ہے اور وہ محنت کے ذریعے پاس ہونے کی بجائے ہال ہی میں دستیاب کتاب و خلاصہ وغیرہ سے فائدہ اُٹھانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اِس کے علاوہ آبادی کے زیادہ ہونے کے ساتھ ہم اپنے تعلیمی نظام اور دفاتر وغیرہ میں اُسی نسبت سے کوئی خاص تبدیلی لانے میں کامیاب نہ ہوسکے جس کی وجہ سے ہر سال امتحانات کے دِن قریب آنے کے ساتھ ایک ہنگامہ شروع ہوجاتا ہے جس سے والدین اور طلبہ بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ اِس کا ثبوت آج کے پرائیویٹ چینل پر دیکھا جاسکتا ہے۔ سندھ میں اِس حوالے سے بہت برا حال ہے وہاں کھلم کھلا نقل ہورہی ہے اور شاید کوئی روکنے والا نہیں، ویسے بوٹی مافیا پاکستان میں ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اِس کے برے اثرات قوم پر اِس حد تک مرتب ہوچکے ہیں کہ میٹرک پاس بندہ اپنے نام کے علاوہ کوئی جملہ نہیں لکھ سکتا۔ بعض اوقات تو اپنے نام کے ہجے بھی غلط لکھ لیتا ہے۔ یہی لوگ پھر آگے ایف۔اے اور بی۔اے بھی پرائیوٹ طور پر کسی نہ کسی طرح کر ہی لیتے ہیں پھر اپنے عوامی نمائندوں کے ذریعے اچھی بھلی سرکاری نوکریاں بھی ہتھیا لینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اِس قسم کے لوگ سرکاری شعبوں میں غلط طریقوں سے آکر ملک و قوم کا ہر لحاظ سے بیڑا غرق کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق اِس قسم کے لوگ ترقی کرتے کرتے بعض اوقات سربراہِ شعبہ بن کر پورے ڈیپارٹمنٹ کو کرپشن کا شکار بنالیتے ہیں۔

حکومت کی تحویل میں چلنے والے اِسی نظامِ تعلیم کے سبب آج ملک میں صورت حال یہ ہے کہ کسی نچلی سطح کی پوسٹ کیلئے درخواست دیتے وقت امیدوار درخواست کسی اور سے لکھواتا ہے۔ یہی چیز آگے بڑھ کر ایم۔اے کی سطح پر پہنچ جاتی ہے اور آج ہمارے ہاں اگر ایک سروے کیا جائے تو یہ پتہ چلے گا کہ کہ ایم۔اے ڈگری یافتہ لوگ بھی اپنے مضمون کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔

ہمارے ہاں پچھلے سالوں میں ایک بڑا المیہ اُس وقت ہوا جب پرویز مشرف نے ملک کو تعلیم یافتہ پارلیمنٹ دینے کیلئے صوبائی وقومی اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لینے کیلئے بی۔اے کی شرط کو لازم قرار دیا۔ ہمارے کئی ایک ممبران نے جس طرح جعلی ڈگریاں حاصل کیں اُس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمارے ملک میں اگر اعلیٰ سطح پر یہ حال ہے تو نچلی سطح پر کیا صورت حال ہوگی۔

پاکستان میں ثانوی اور انٹر میڈیٹ کی سطح پر تعلیمی ابتری کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اِن دو امتحانات پر پورے صوبے میں لاکھوں طلبہ پر لاکھوں کروڑوں روپیہ خرچ ہو جاتا ہے لیکن ہمارا نظام اس قدر شکستہ وخستہ ہو چکا ہے کہ ہم اِن امتحانات کے ذریعے میڈیکل اور انجینئرنگ جیسے پروفیشنل اداروں میں داخلے کیلئے ہزاروں طلبہ وطالبات کو ایک اور امتحان سے گزارتے ہیں جس کو عُرفِ عام میں انٹری ٹیسٹ کہا جاتا ہے۔ ذرا تصور کیجئے کہ ہم یہ انٹری ٹیسٹ اِس لئے لیتے ہیں کہ ہمیں بورڈ کے انتظامات وامتحانات پر اعتبار اور بھروسہ نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اِس لئے کہ امتحانات میں بوٹی مافیا چلتی ہے جس کی وجہ سے بعض نااہل یا غیر مستحق طلبہ بھی پروفیشنل کالجوں میں پہنچ جاتے تھے لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بورڈ کے امتحانات میں گڑ بڑ ہوتی ہے تو کیا انٹری ٹیسٹ کے امتحانات کے انعقاد وانتظام کیلئے کہیں آسمان سے فرشتے اُترتے ہیں۔ اگر نہیں تو پھر وہ نظام بورڈ کی سطح پر کیوں نہیں اپنایا جاتا جو انٹری ٹیسٹ کی سطح پر نافذ کیا جاتا ہے جس کو لوگ تسلیم کر لیتے ہیں۔ کیا واقعی انٹری ٹیسٹ پاکستان میں رائج "جُھرلو" سے محفوظ ہوتا ہے۔ باقی آئندہ۔۔۔۔

☆......☆......☆

پاکستان کے تعلیمی ادارے اور ہمارا مستقبل[۳]

تعلیم کے میدان میں عالمِ اسلام اور پاکستان کا المیہ ملاحظہ کیجئے کہ سائنس کے میدان میں تو ہم پیچھے رہ ہی گئے، اپنے دینی اور مذہبی علوم کے حوالے سے بھی گذشتہ ڈیڑھ صدی سے عجیب تذبذب کے شکار چلے آ رہے ہیں۔ دین کی بنیادی تعلیمات تو مسلمانوں کو ایک امت بنانے اور اُن کے درمیان اخوت کی بنیادوں پر تعلقات استوار کرنے پر مشتمل ہیں، لیکن عالمِ اسلام صرف ستاون ملکوں ہی میں بٹا ہوا نہیں ہے بلکہ ہر ملک اندرونی طور پر مختلف اختلافات اور تنازعات کا شکار ہے۔ عالمِ اسلام جو کبھی ایک خلافت یا حکومت کے زیرِ نگین تھا، جس میں عرب اور عجم، ایرانی، تورانی اور افغانی سب ایک تھے۔ سیاسی مذہبی مفادات کی لالچ و حرص کی وجہ سے ملکوں میں بٹتا چلا گیا۔ ستاون یا چھپن ملکوں میں تقسیم ہو کر اگر تکلیف و مصیبت کے وقت بھی ایک رہتے اور ایک دوسرے کی مدد کیلئے کندھا دینے کیلئے پیش پیش رہتے تو شاید آج اِس ناگفتہ بہ صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

ہم آج بھی اسلامی تاریخ اور فقہ کی اپنی اپنی تدوین اور تشریح و تعبیر کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی ایسی باتوں پر اُلجھے رہے ہیں جس کا ہماری معاشرت اور سماج سے براہ راست بہت کم تعلق ہے۔ ہم تو وہ بدقسمت لوگ ہیں کہ ایک ملک میں رہتے ہوئے ایک اللہ، ایک رسولؐ، ایک قرآن اور ایک ہی خانۂ خدا کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کے باوجود اُن مقامات میں بھی جہاں طلوع و غروب شمس کی وجہ سے وقت کا کوئی فرق نہیں، ایک ہی وقت پر اذان، نماز اور اِسی طرح رمضان کے مہینے میں سحر اور افطار ایک وقت پر کرنے سے محروم ہیں۔ اِن معاملات کا نصابِ تعلیم سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ وطنِ عزیز کی گزشتہ ساٹھ برس میں معاشرتی، سماجی اور حکومتی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں جو کچھ ہوتا رہا ہے یہ اِس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں بہت بڑی خامیاں موجود ہیں ورنہ ایک ملک جو ایک بہت اعلیٰ نظریے اور نصب العین کے تحت وجود میں آیا وہ سترہ کروڑ آبادی میں ایک لاکھ سائنسدان، ایک لاکھ ڈاکٹر، انجینئر اور اِسی طرح زندگی کے دیگر شعبوں کو صحیح خطوط پر چلانے کیلئے ماہرین پیدا کرنے میں کیوں ناکام رہے۔ حالانکہ پاکستان کے لوگوں میں اہل، قابل اور صلاحیتوں سے بھرپور افراد کی کمی نہیں کیونکہ ہمارے یہی لوگ جب باہر کے ممالک میں جاتے ہیں تو بہت ساری اقوام کے افراد کے

درمیان ایک نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں ہماری مشکلات، مصائب اور مسائل کی بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن سب سے بڑا اور سب سے بنیادی وجہ تعلیم کا فقدان اور تعلیم کا صحیح خطوط پر دستیاب نہ ہونا ہے۔ آج اکیسویں صدی میں جہاں دُنیا بھر میں تعلیم کو سب سے زیادہ ترجیح دی جاتی ہے اور بجٹ کا ایک قابلِ ذکر حصہ بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے مختص کیا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں وسائل کی کمی کے ساتھ ساتھ دستیاب وسائل کو نظم وضبط کے ساتھ خرچ کرنے کی فول پروف منصوبہ بندی نہ ہونے کی وجہ سے ملک وقوم کے مستقبل کا بہت بڑا نقصان ہو رہا ہے۔

پرائمری سکول کی سطح سے ثانوی تک محکمہ تعلیم کے اہل کاروں کی کارکردگی اتنی حوصلہ شکن ہے کہ اُس کی وجہ سے اساتذہ کرام بالخصوص خواتین اساتذہ بہت زیادہ مشکلات کا شکار رہتی ہیں۔ خواتین اساتذہ اپنی محکمانہ ترقی، اریئرز یا کسی الاؤنس وغیرہ کیلئے جب تک متعلقہ کلرکوں کی مٹھی گرم نہیں کرتے تو اُن کا کام کبھی نہیں ہو سکتا۔ اِس کے علاوہ خواتین اساتذہ خاندانی، سماجی اور محکمانہ دباؤ کی وجہ سے اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں وہ کردار ادا ہی نہیں کر سکتیں جو کسی قوم کے نونہالوں کی تعلیم وتربیت کیلئے ضروری ہوتا ہے۔

اِس کے علاوہ پاکستان میں سماجی لحاظ سے گذشتہ دس بارہ سال میں جو ناپسندیدہ تغیرات وتبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں اُس میں تشدد پسندی ہمارے معاشرے کی پہچان بن چکی ہے۔ اِس کی وجہ تعلیمی اداروں کے سربراہان، ہیڈ ماسٹرز اور پرنسپل وغیرہ آج تیس چالیس پہلے کی طرح علم وکردار کے لحاظ سے مضبوط نہ رہے اور اساتذہ پر اُن کی منتظمانہ گرفت اُس طرح سیاسی اور سماجی اثر ورسوخ کی وجہ سے باقی نہیں رہی۔ جس کی وجہ سے نہ تو طلبہ سکولوں میں حاضری میں سنجیدہ ہیں اور نہ ہی اساتذہ اپنا پتّہ مارنے کو تیار ہیں اور اِس سب کا نتیجہ آج کی تعلیمی افراتفری کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔

پاکستان میں پنجاب کے علاوہ تین صوبوں میں کالج سطح کی تعلیم کا بہت برا حال ہے۔ وہاں بعض ایسے اساتذہ کرام چھوڑ کر جو خوفِ خدا اور حلال روزی کمانے اور ملک وملت کا کچھ درد دِل میں لئے کام کر رہے ہیں ورنہ آپ صوبہ سرحد کے کسی کالج بالخصوص دور پار کے اضلاع میں قائم کالجوں میں جا کر دیکھئے تقریباً گیارہ بجے تک ساری کلاسیں سمٹ سمٹا کر پایۂ تکمیل تک پہنچ چکی ہوتی ہیں اور معزز پروفیسر صاحبان اپنے دیگر ضروری

کاموں کو سرانجام دینے کیلئے "اور بھی غم ہیں زمانے میں پڑھانے کے سِوا" گنگناتے ہوئے عازمِ منزل ہو چکے ہوتے ہیں۔

طلبہ کالجوں کے اِس ماحول کو غنیمت جانتے ہوئے ایک آدھ کاپی ہاتھ میں لئے ایک آدھ کلاس میں جسمانی حاضری کے ساتھ حاضر ہو جاتے ہیں باقی دو تین کلاسیں کینٹین میں چائے پینے یا اپنے موبائل پر یار دوستوں کے ساتھ گپ شپ لڑانے میں مشغول پائے جاتے ہیں۔ ایسے میں اِن اداروں سے وہ نوجوان کیسے دستیاب ہو سکتے ہیں جو ملک وقوم کے مستقبل کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کیلئے درکار ہوتے ہیں۔

ہاں! ہمارے ملک نظامِ تعلیم کا ایک ایسا سلسلہ بھی پایا جاتا ہے جہاں سے ایسے نوجوان سامنے آتے ہیں جو تعلیم کے اعلیٰ معیار [جس میں انگریزی تعلیم سرفہرست ہے] حاصل کرنے پر زور دیا جاتا ہے اور وہاں سے جو نوجوان تیار ہوتے ہیں، اُن میں سے کچھ تو پاک افواج میں کمیشن لے کر شمولیت اختیار کر لیتے ہیں اور کچھ ڈاکٹرز اور انجینئرز بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ جس آمیرانہ پس منظر کے ساتھ اَیچیسن اور کیڈٹ کالجز کے ماحول میں پروان چڑھ کر آگے بڑھتے ہیں وہ ہمارے معاشرتی مسائل کا بہت کم ادراک رکھنے کے علاوہ بہت کم شرح کی آبادی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عملی زندگی میں اپنے اپر کلاس کی نمائندہ بن کر ایلیٹ کلاس میں شامل ہو جاتے ہیں اور بے چارے عوام کے بہت کم کام آتے ہیں۔

یہ تو ہمارے سکولز اور کالجز میں تعلیم و تعلم کی صورت حال کے بارے میں مختصر روداد تھی۔ مدرسوں کا بھی مختصر ذکر پہلے ہو چکا۔ اب ہماری جامعات کی سطح پر تعلیم کا حال سنئے۔ جامعات کسی بھی ملک کی حکومتی سطح پر پالیسی سازی کے علاوہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے والوں کی کردار سازی کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ جات کیلئے مطلوب افراد کی تیاری میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری جامعات وہ کردار ادا کرنے میں ناکام ہو رہی ہیں۔ ایک آدھ مثال کو ہم نادر کے زمرے میں لے کر بات نہیں کریں گے۔ ہماری جامعات پی ایچ ڈی کی ڈگریاں بانٹنے کے کارخانے تو ضرور بن چکی ہیں لیکن بین الاقوامی اصولوں اور شرائط کے مطابق تعلیم و تحقیق کا مرحلہ شاید ابھی دور ہے۔

پاکستانی جامعات میں تعلیم و تحقیق کے حوالے سے کسی مناسب وقت پر انشاء اللہ ایک الگ تفصیلی کالم میں بات ہو گی لیکن یہاں اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ ہائر ایجوکیشن کمیشن کی تگ و دو کے باوجود حالات کچھ زیادہ

سازگار و خوشگوار نظر نہیں آتے۔ ہماری جامعات میں معیارِ تعلیم کے گرنے گرانے میں سیلف فنانس سکیموں اور پی ایچ ڈی الاؤنس اور اساتذہ کیلئے بعض دیگر مراعاتی پیکج نے بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ اِس پر مستزاد ہمارے معاشرتی اور سماجی بندھن بہت کم لوگوں کو اصولوں پر جم کر کام کرنے کے مواقع دیتے ہیں۔ اِسکے علاوہ پرائیوٹ سیکٹر میں قائم ہر مضمون میں ڈگریاں بانٹنے کیلئے جو تعلیمی ادارے سکولز، کالجز اور جامعات کی صورت میں قائم کرنے کی اجازت دی گئی اِس نے علم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

اگر پرائیوٹ سیکٹر میں قائم اداروں کا ایک آدھ استثنیٰ کے ساتھ بے لاگ سروے کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ بی بی اے۔ بی آئی ٹی، بی سی ایس، بی ایڈ، ایم ایڈ اور ایل ایل بی کی ڈگریاں ریوڑیوں کے مول تقسیم کی جا رہی ہیں۔ اِن اہم مضامین میں معاشرے میں بے روزگاری کی وجہ سے اہل لوگ مارے مارے پھرتے ہیں۔ لیکن اِن پرائیوٹ اداروں میں پیسوں کے زور پر ڈگریاں لینے والوں میں زیادہ تر صاحب ثروت لوگ ہونے کی بناء پر جاب حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اپنے مضمون میں اہلیت و مہارت نہ رکھنے کی بناء پر جس شعبے میں چلے جاتے ہیں وہاں عجیب " گلہائے رنگا رنگ " کھلاتے رہتے ہیں اور ملک و قوم کے مستقبل سے کھیلتے رہتے ہیں۔ کالم کی تنگ دامنی تفصیل کی اجازت نہیں دیتی۔ لہٰذا بعض اہم باتوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے اور بنیادی اشاروں پر اکتفا کرتے ہوئے اربابِ اقتدار اور ذمہ دارانِ تعلیم سے اتنی سی درخواست ہے کہ اگر کسی کے دِل میں واقعی ملک و قوم کیلئے درد ہے تو وطنِ عزیز کیلئے ہنگامی بنیادوں پر بہترین نصابِ تعلیم [جو عصری تقاضوں اور وطنِ عزیز کی نظریاتی و سماجی ضروریات کے مطابق ہو] بنا کر نافذ کرنے کے بارے میں کام کرنا ہوگا ورنہ موجودہ صورت حال کے ساتھ ہمیں اپنے مستقبل کے بارے میں فکرمندی کا لاحق ہونا لازمی ہے۔

☆......☆......☆

پاکستانی جامعات کے ساتھ حکومت کا عجیب رویہ

آج کے زمانے میں ملکی ترقی میں جامعات کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے۔ملکی جامعات میں نہ صرف ٹاپ برین کا اجتماع ہوتا ہے بلکہ وہاں ملک وقوم کی مستقبل میں باگ ڈور سنبھالنے کے لئے نئی نسل کی نشوونما، تعلیم و تربیت اور ملکی ضروریات کے مطابق آبیاری ہوتی ہے۔ترقی یافتہ ممالک میں تو جامعات وہاں کی صنعتی اور معاشی ضروریات کی تکمیل کیلئے مناسب وموزوں افراد کی فراہمی کے علاوہ سیاسیات اور حکومتی پالیسیوں پر بھی جامعات کے اساتذہ کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔اسی طرح زندگی کے سارے شعبوں میں تعلیم و تحقیق کے ذریعے وقت کی ضروریات کے مطابق کام کرنا بھی جامعات کے ذمے ہوتا ہے۔جامعات کی اِسی اہمیت وافادیت کے پیش نظر پاکستان سے رقبہ، آبادی اور وسائل میں چھوٹے مگر ترقی یافتہ ممالک ہونے کی بناء پر سینکڑوں ہزاروں یونیورسٹیاں قائم ہیں اور اُن میں سے بعض اہم یونیورسٹیوں کا بجٹ پاکستان کے کل بجٹ سے زیادہ ہوتا ہے۔

ترقی یافتہ ممالک میں عمومی طور پر تعلیم کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے وہاں پرائمری سے لیکر جامعات تک سارے تعلیمی ادارے حکومتوں کی اعلیٰ ترجیحات میں شامل ہوتے ہیں۔اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس کے بغیر ترقی کے خواب دیکھنا شیخ چلی کے خواب تو ہو سکتے ہیں، شرمندۂ تعبیر ہونے والے خواب کبھی نہیں ہو سکتے۔لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عالمِ اسلام میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص تعلیم کو کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں گیا کہ یہ ملک وقوم کی ترقی و بقا کیلئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ عالمِ اسلام عام استعمال کی چیزوں سے لیکر بچوں کے کھلونوں اور ملکی دفاع کیلئے ضروری اسلحہ تک کیلئے غیر مسلم ترقی یافتہ ممالک کا محتاج ہے۔اِس محتاجی کے جو اثرات عالمِ اسلام پر مرتب ہوئے ہیں اِس کا حسرت ناک تماشا شاید فلکِ نیلگوں نے اکیسویں صدی سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ناجائز طور پر قائم چھوٹا سا اسرائیل دفاع کیلئے ضروری عام استعمال کے مہلک وآتشیں اسلحہ سے لیس ہونے کے علاوہ کم از کم ۲۰۰ ایٹم بموں کا حامل ملک ہے۔جدید سے جدید ٹیکنالوجی اُس کی دسترس میں ہے۔مانتا ہوں کہ اُس کے سر پر امریکہ بہادر کا دست شفقت ہے جس کی وجہ سے اسرائیل کو بہت ساری سہولیات حاصل ہیں لیکن یہ بھی تو ماننا پڑیگا کہ آفریں ہو

یہودی سکالرز، علماء، محققین پر کہ موجودہ سائنسی انقلاب کے طفیل ساٹھ ستر فیصد ایجادات وانکشافات کا سہرا اِن کے سروں پر سجتا ہے۔ کروڑ یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ کروڑ یہودی آبادی آخر کس گیدڑ سنگی کے طفیل دُنیا پر غالب آ گئی ہے تو صرف اور صرف، تعلیم و تحقیق کے ذریعے۔

یہاں وہ ساری فتوحات، ایجادات، کمالات، انکشافات، اختراعات شمار نہیں کی جا سکتیں لیکن یہ تو سارے اہل نظر کو معلوم ہے کہ دُنیا کے تین اہم شعبے اِس وقت علم و تحقیق کے زور پر اہلِ تورات کے قبضے میں ہیں۔

زرگری [اس سے مراد پیسہ پیدا کرنے کے سارے ذرائع ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ آج کی جدید بنک کاری، آئی ایم ایف، ورلڈ بینک وغیرہ کی بنیادیں یہودی سُنار ہی نے ڈالی تھیں]۔ ٹیکنالوجی اور شعبہ نشر و اشاعت [پرنٹ والیکٹرانک میڈیا] اِن تینوں شعبوں میں یہود نے جو کمالات دکھائے ہیں اُن کو دیکھ اور پڑھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ میں تو یہودیوں کے ساتھ ہزار مذہبی، تاریخی اور نظریاتی اختلافات کے باوجود اُن کے بے مثل جدوجہد اور اُس کے ثمرات کو بے اختیار صد آفریں پیش کرتا ہوں۔ کسی موقع پر اِن تین شعبوں کی تفصیلات اپنی قوم کی نوجوان نسل کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کروں گا کہ شاید کسی کے دِل میں کوئی ترنگ اور اُمنگ انگڑائی لے سکے۔

اب اِس کے بالکل معکوس بلکہ رجعت قہقری کے انداز میں اپنے گھر کی خبر لیجئے۔ مملکت خداداد میں لے دے کر اور شاید کھینچ تان کر کل تیس چالیس جامعات ہونگی۔ ۹۹-۱۹۹۸ء تک اِن کا نظام لشٹم پشٹم چلتا رہا لیکن اس کے بعد جب ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب نے ہائر ایجوکیشن کے چیئرمین کی حیثیت سے جامعات کی اصلاح کا بیڑہ اُٹھایا تو ہم جیسے خوش فہم لوگ واقعی بہت خوش ہوئے کہ شاید اب دیر سے سہی ہماری بھی کوئی یونیورسٹی عالمی پائے کی یونیورسٹیوں کی ہم پلہ ہو جائیگی۔ اِس میں شک نہیں کہ کچھ چیزوں اور بعض جگہوں میں سوچ و فکر میں کچھ مثبت تبدیلیاں تو پیدا ہو چکیں۔ دیکھنے کی حد تک طلبہ و طالبات اور اساتذہ کو اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرون ملک سکالرشپس پر بھیجا گیا۔ یونیورسٹیوں میں T.T.S وغیرہ سکیم کے ذریعے تنخواہوں وغیرہ میں اضافوں کے ذریعہ اچھی باتیں بھی سامنے آئیں لیکن جس طرح پاکستان میں ساٹھ برس سے ہوتا آیا ہے کہ ترقی کے نام پر ترقی یافتہ ممالک کی بعض نیم ترک چیزوں کو اُٹھا کر نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر چند برس بعد اُس نظام کے لانے والے پر تبرا بھیجنا شروع ہو جاتا ہے اور اُس کو چلتا کر دیا جاتا ہے اور اُس کے پیچھے اُس کا شروع کردہ

نظام بہت بگڑی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ہماری جامعات کے ساتھ بھی یہی کھیل کھیلا گیا۔ پہلے مرحلے میں اعلیٰ تعلیم کو عام کرنے کیلئے پرائیوٹ اور پبلک سیکٹر میں کسی خاص منصوبہ بندی کے بغیر یونیورسٹیوں کو آکاس بیل کی طرح پھیلا گیا۔ نہ کمرہ، نہ میدان، نہ صحن، نہ لائبریری، نہ ضروری فیکلٹی، بس مانگے تانگے پر تعلقات اور سفارش اور دیگر ذرائع استعمال کر کے پہلے سے موجود جامعات اور تعلیمی اداروں کے بطن پھاڑ کر اُن مضامین میں شعبہ جات قائم کئے گئے جو پہلے سے موجود تھے۔ اِن جامعات کی وجہ سے تعلیم و تحقیق کو تو شاید ہی کوئی معتدبہ فائدہ ہوا ہو لیکن بعض لوگوں کا بھلا ضرور ہوا کہ اُن کو روزگار مِل گیا اور حکومت کے خزانے پر بوجھ میں اضافہ ہوا۔ اِس عمل کے ذریعے اور نقصانات کا اندازہ بعد میں کہیں سامنے آئیگا۔ تاریخی جامعہ پشاور کو اِس لحاظ سے بہت نقصان ہوا کہ اِس کی فیکلٹی دیگر جامعات میں بھی پڑھانے لگی۔ جس کے نتیجے میں ایک بھاگم بھاگ شروع ہوئی، نہ جامعہ پشاور میں دل جمعی کے ساتھ کلاس، نہ نئی جامعات میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے۔ نتیجۃً ملک وقوم کا علمی و تحقیقی نقصان اور ملکی خزانے پر کئی گنا بوجھ۔

اگرچہ بہت سارے دیگر عناصر وعوامل کی وجہ سے پاکستان میں تعلیم کی ناؤ ہمیشہ سے ڈگمگاتی رہی ہے لیکن آج کل پاکستانی جامعات میں موجودہ بے چینی کی ایک اہم وجہ یہ بن رہی ہے کہ حکومت نے ۲۰۱۰ء کے بجٹ میں سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں جو اضافہ کیا ہے وہ ابھی تک جامعات کے ملازمین کو نصیب نہیں ہوا ہے۔ کتنی عجیب اور بدقسمتی کی بات ہے کہ وہ ہائر ایجوکیشن کمیشن جو جامعات کی ترقی اور اساتذۂ کرام کو اطمینان بخش ماحول فراہم کرنے کیلئے بنا تھا، آج رقوم کی عدم فراہمی کی وجہ سے جامعات کے اساتذۂ کرام اور دیگر عملہ کی ناراضگی اور عتاب کا نشانہ بنا ہوا ہے۔

ہماری سرکار کے بعض بڑے وزیر اور افسر بھی بادشاہ لوگ ہوتے ہیں۔ اپنی حکومت کے اعلان و احکام پر عمل کرنے میں تردد کرتے ہوئے حکومت کیلئے مسائل بناتے ہیں۔ اب یہ بوالعجبی اور لن ترانی ملاحظہ کیجئے کہ تنخواہوں میں پچاس فیصد اضافے کے نوٹیفکیشن کے بعد سارے سرکاری ملازمین کو اضافہ شدہ تنخواہ بھی مل چکی ہے لیکن ملک کے حساس ترین اور اہم ترین شعبۂ تعلیم جامعات کے اساتذہ اور عملہ کو اِس لئے نظرانداز کیا جارہا ہے کہ خزانہ میں سکت نہیں ہے۔ بھئی اگر سکت نہیں تھی تو اضافے کا اعلان ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جب اعلان

ہوا اور جامعات کے علاوہ دیگر شعبوں کے سرکاری ملازمین کو اضافہ شدہ تنخواہیں دی گئیں بلکہ جامعات میں بھی بعض جامعات نے اضافہ شدہ تنخواہیں ریلیز کی ہیں، تو جامعات کے اساتذہ اور عملہ کو کیوں احتجاج، ہڑتال وغیرہ کی طرف دھکیل کر ملک کے پہلے سے ابتر حالات میں اضافے کا سبب بنایا جارہا ہے۔ اب ہمارے وزیر خزانہ نے جامعات کو نیا نسخہ یہ پیش کیا ہے کہ جامعات فیسوں میں اضافہ کرے اور اپنے ذرائع آمدن پیدا کرے۔ سیلاب زدگان والدین کی پشت پر اِس مہنگائی کے دور میں مزید بوجھ مرے کو مارے شاہ مدار" کے مصداق ہوگا اور طلبہ وطالبات کا احتجاج اپنی جگہ پر ہوگا۔ اِس کے علاوہ جامعات اگر ذرائع آمدن پیدا کرنے میں لگ گئے تو پہلے سے مادیات کے بوجھ تلے سسکتا معاشرہ مزید بحرانوں کا شکار ہوگا۔ لہٰذا سرکار سے دست بستہ عرض ہے کہ اپنے لئے مزید بحران پیدا کرنے سے گریز میں خیر ہے۔ جامعات کو ملک وقوم کی تعمیر کے مراکز ہی رہنے دیں اور اساتذہ کرام کو بے چینیوں میں مبتلا کرنے سے محفوظ رکھیں کہ اِس پرآشوب دور میں قوم کے بیڑے کو پار لگانے کیلئے اساتذۂ کرام کے وجود کی سخت ضرورت ہے۔

☆......☆......☆

تفہیم دین

میں لفظ اکیڈمی (Academy) یا اکادمی سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ بعض الفاظ میں تاریخی پس منظر اور خود اس لفظ کے تلفظ میں ایک خاص علمی چھاپ اور ترنم کی وجہ سے ایک فطری رعب داب موجود ہوتا ہے۔ تاریخ میں لفظ اکیڈمی کا استعمال پہلی دفعہ یونان میں افلاطون کے دور میں ہوا۔ ایتھنز کے باہر ایک عوامی باغ تھا جس میں افلاطون نے غیر رسمی طور پر اپنے معتقدین کو پڑھانا شروع کیا جو بعد اکادمی کے نام سے مشہور ہوا اور یہ ۳۸۷ ق م کا زمانہ تھا۔ ایک زمانے تک دنیا میں یونان وہاں کے علماء اور حکماء افلاطون، ارسطو، سقراط، بقراط، ارشمیدس، جالینوس وغیرہ وغیرہ اور ان کی اکیڈمی یہاں علوم وفنون کے مراکز کے طور پر مشہور ومعروف رہیں۔

پھر جب انسانیت کو اللہ تعالیٰ نے خاتم النبیین ﷺ کی منور تعلیمات کے ذریعے اندھیرے سے روشنی کی طرف آنے کا موقع فراہم کیا تو نبی ﷺ کے پیروکار ہی دنیا میں علم کی روشنی پھیلاتے چلے گئے۔ عباسی دور میں مسلمانوں نے علوم وفنون کو ترقی کے اس معراج پر پہنچایا کہ یورپ کی جہالت کی وجہ سے یونان میں ان اکیڈمیوں کا جو اثاثہ مقفل پڑا تھا، نبی ﷺ کے پیروکاروں کے طفیل دنیا کے سامنے آیا۔ مسلمانوں کے ساتھ یہ علمی امانت سپین پر مسلمانوں کی حکومت کے ذریعے یورپ میں عام ہوا۔ سپین میں مسلمانوں کے شاندار علمی اداروں اور علماء وفضلاء کے ذریعے یورپ کی موجودہ سائنسی معراج کی بنیادیں پڑیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ جس زمانے میں یورپ یونان اور مسلمانوں کے علوم وفنون کو اپنی زبانوں میں ڈھال کر علمی اداروں (Academies) کی بنیادیں ڈالنے میں مصروف تھے، ہم مسلمان غیر ضروری علمی مسائل میں الجھ کر رہ گئے۔ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمانانِ عالم سپر پاور کے تحت سے گر کر ایسے خاک نشین ہو گئے کہ رزقِ خاک ہو گئے۔ ہماری اسی سستی، نالائقی اور غیر ضروری اور غیر مفید علمی مشاغل کی وجہ سے ہلاکو خان نے بغداد میں ہمارے آباواجداد کے علمی میراث کو دجلہ میں بہا کر ہماری موجودہ نسلوں کی طرف بڑھانے کا موقع ہی ختم کر دیا۔

برصغیر پاک وہند پر مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ حکومت کے دوران جو علمی اثاثہ جمع ہوا تھا، برطانویوں کی راج کے بعد انگریزی کو دفتری زبان قرار دینے سے اس کی اہمیت ہی وہ نہ رہی جو ہونی چاہیئے تھی۔ انگریزی

راج کے اثرات اور ردِ عمل کے طور پر برصغیر میں مسلمانوں کے دو بڑے ادارے مدرسۂ دیوبند اور علی گڑھ کالج تشکیل پائے۔ دونوں اداروں کا ماٹو اور مقصد مسلمانانِ ہند کی بھلائی اور بہتری تھی لیکن تاریخ گواہ ہے کہ یہ ان اداروں سے فارغ التحصیل افراد دو مختلف بلکہ بعض اوقات تو ۱۸۰ درجے کے زاویے کی حد تک ایک دوسرے سے الٹ سمت میں سوچنے اور چلنے لگے۔ اسی کے اثرات قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک محسوس کئے جا رہے ہیں۔

مملکتِ خداداد میں مدرسہ اور سکول آج بھی دو ایسے متوازی خطوط پر گامزن ہیں جن کے آپس میں تعمیری انداز میں ملنے کے امکانات بہت کم دکھائی دیتے ہیں لیکن وقت کی ضرورت اور پکار یہی ہے کہ مسلمانوں کو دنیاوی اور دینی دونوں قسم کے علوم کی اشد ضرورت ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ مدرسے کے طلباء انگریزوں کی زبان انگریزی اس حد تک ضرور سیکھیں کہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ مکالمہ تو کر سکیں۔ ان کو ان زبان میں قرآن کریم کی روشن تعلیمات پہنچا سکیں۔ ان کے ساتھ علمی بنیادوں پر مناظرہ، مباہلہ، مکالمہ، مقابلہ، رابطہ، بغیر کسی لسانی دشواری اور رکاوٹ کے کر سکیں۔ قرآن کریم کا ایک اچھا خاصا حصہ یہود و نصاریٰ سے متعلق معلومات واحکامات پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس بات کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے کہ آج کے گلوبل ویلیج کے حالات میں ہمارے دینِ متین کے علمبردار آج کے رائج علوم بالخصوص انگریزی، کمپیوٹر وغیرہ سے نابلد رہیں۔ اس طرح سکول اور کالجوں کے طلبہ کے لئے ان کے والدین کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایک مسلمان کے لئے ضروری اسلامی علوم سے بہرہ ور ہوں۔ یہ بات اتنی اہم ہے کہ آج امریکہ اور یورپ میں مقیم مسلمانانِ عالم کی آخری خواہش یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے مسلمان رہیں اور وہ خود مسلمان کی حیثیت سے اسلام کے قواعد و ضوابط کے مطابق دنیا سے سفر پر جائیں۔ اس کام کے لئے مغربی دنیا میں اسلامک سنٹرز کے نام سے ایسے تعلیمی ادارے وجود میں آئے ہیں جو مسلمان بچوں کو ناظرۂ قرآن کریم منتخب احادیث اور ضروری مسائل سے باخبر رکھنے کے لئے مختلف نصابات پڑھائے جاتے ہیں۔ الحمدللہ کہ دیارِ مغرب میں بھی مسلمان والدین اپنا یہ بنیادی فریضہ بھولے نہیں ہیں بلکہ وہاں تو شاید ایک گونا زیادہ توجہ دی جاتی ہے کیونکہ

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے

مملکتِ خداداد پاکستان کی بنیادوں میں اسلام اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے جس طرح انسانی جسم

میں خون شامل ہوتا ہے لٰہذا پاکستان کی نئی نسل جو اس وقت واضح طور پر دو متوازی دھاروں سکول اور مدرسہ کی پیداوار ہے، کے لئے اس بات کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ دونوں کو ذہنی، نظریاتی اور فکری طور پر اس طرح ملایا جائے کہ یکجان دو قالب کی صورت اختیار کر کے ملک وقوم کے لئے ریڑھ کی ہڈی ثابت ہو جائے۔ اس سے نہ صرف قوم وملک مضبوط و توانا ہوں گے بلکہ فرقہ واریت، تعصّبات اور تنگ نظری میں بھی کمی آئے گی۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے پورے پاکستان میں کام ہو رہا ہے لیکن یہ کام کہیں ناکافی ہے اور کہیں اخلاص کی کمی اور دنیاوی اغراض ومقاصد کے غالب ہو جانے کے وجہ سے وہ نتائج نہیں دے رہا جن کی ضرورت ہے۔

صوبہ سرحد جو اس وقت تعلیمی لحاظ سے پسماندگی کا شکار ہے اور دنیاوی و دینی تعلیم کے حوالے سے ایک واضح خطِ تقسیم رکھتا ہے، اس بات کی شدت کے ساتھ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ یہاں ایسے ادارے پروان چڑھیں جو ملک وقوم کی نئی نسل کو ایک طرف مضبوط دینی بنیاد فراہم کرے اور دوسری طرف عصری علوم میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے چند درد مند اور صاحبِ دل ونظر لوگوں نے مل کر ایک ایسے ادارے کی بنیاد رکھی جو اپنی نوعیت اور طرز کا صوبہ سرحد میں شاید پہلا اور واحد ویکتا ادارہ ہوگا۔ اس ادارے کے روحِ رواں صوبہ سرحد کی مشہور ومعروف دینی شخصیت مولانا محمد اسماعیل صاحب ہیں جن کے دروسِ قرآن کریم اس وقت پورے صوبے میں بلا امتیاز مسلک ومکتب، اخلاص واعتدال کی وجہ عوام الناس کی توجہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ سندِ اعتبار بھی رکھتے ہیں۔

اس خوبصورت ادارے کا نام بھی بہت خوبصورت اور دلکش ہے۔ ''تفہیم دین اکیڈمی'' اپنی خوبصورت عمارت کے ساتھ ایک کشادہ، صاف ستھری اور تاریخی اسلامی طرزِ تعمیر کی حامل مسجد کے ساتھ صوبہ سرحد کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کی آبادی فیز 6، سیکٹر F-5، شیر شاہ مارکیٹ، کے پہلو میں اپنے وجود کا اعلان کر رہا ہے۔

پاکستانی قوم کا کمال یہ ہے کہ اس کے ہر فرد کی خواہش ہے کہ وہ اپنی اولاد کو چاہے وہ خود کسی تعلیمی ادارے کے پچھواڑے سے بھی نہ گزرے ہوں یا چاہے بعض کی اولاد دنیا کے مہنگے اور اعلیٰ ترین اداروں میں تعلیم حاصل

کر رہے ہوں۔ لیکن ان کو دینی تعلیم، کم از کم دین کے بنیادی عقائد و مسائل سکھانے سے غافل نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں ہو کہ شہر، ہر گھر میں قرآن کریم سکھانے اور پڑھانے کا بندوبست جاری و ساری ہے۔

پشاور کے حیات آباد جیسی جدید آبادی میں عرصے سے ایک ایسے ادارے کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو اس علاقے کی اس بنیادی ضرورت کو پورا کرے۔

تفہیم دین اکیڈمی حیات آباد نے امسال جولائی اگست میں اپنے ہمہ گیر تعلیمی پراجیکٹ کے ایک جزو پر عمل کرتے ہوئے حیات آباد کے سکول/کالج کے طلبہ کے لئے سمر کیمپ (Summer Camp) کے انتظام سے ابتدا کی ہے اور یہ کامیابی کے ساتھ جاری ہے اور ۱۴ اگست کو پایۂ تکمیل تک پہنچ جائے گا۔

اس ادارے کے تعلیمی پراجیکٹ کے دو حصے ہیں جس کے پہلے مرحلے میں ان طلبہ کو بنیادی دینی علوم کے حصول کے مواقع فراہم کئے جائیں گے جو حیات آباد کے بہترین عصری علوم کے اداروں میں داخل ہیں۔ دوسرے مرحلے میں خود ایسے ادارے [تفہیم دین اکیڈمی] میں بچوں کو اعلیٰ ترین عصری علوم اور تحقیقاتی پروگرامات مناسب اوقات کی کورسز کی صورت میں بہترین ماحول میں پڑھائے جائیں گے۔

تفہیم دین اکیڈمی کے یہ ادارے ان والدین کی ضرورت پوری کریں گے جو اپنی اولاد کی تعلیمی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کرداری سازی کے عمل سے بھی غافل نہیں لیکن وقت کی کمی کی بناء پر وہ یہ خواہش دل ہی میں لئے رہے۔ یہ ادارے حیات آباد کے طلبہ کی اس ضرورت کو پورا کریں گے۔

پہلے مرحلے میں کے لئے مجوزہ پروگرام کی تفصیل حسب ذیل ہے:

☆ سکولوں اور کالجوں میں پڑھنے والے طلباء کے لئے دینی علوم کا مکمل انتظام۔

☆ طلبہ کی ضروریات سے ہم آہنگ اوقاتِ تدریس۔

☆ معاشرے کے تمام افراد کے لئے دینی علوم پر مشتمل آسان کورسز۔

☆ گرمی کی چھٹیوں میں بچوں کے لئے سمر کیمپ کا انتظام۔

☆ مصروف لوگوں کے لئے چھٹی کے دن ہفتہ وار کورسز۔

☆ علاقے کے بچوں کے لئے ناظرۂ قرآن، حفظ، تجوید اور قرأت کا اہتمام۔

☆ ترجمہ وتفسیر قرآن پر مشتمل مختصر اور لمبے دورانیئے کے پروگرام۔

☆ دینی اور عصری علوم پر دسترس رکھنے والے ماہر اساتذۂ کرام کی نگرانی۔

☆ دینی کتب پر مشتمل لائبریری۔

☆ بچوں کے لئے پک اینڈ ڈراپ کی سہولت۔

شعبۂ تعلیم بالغاں:

اس پروگرام کے دو حصّے ہوں گے۔ حیات آباد اور اس کے آس پاس کے وہ لوگ جو روزانہ ڈیڑھ گھنٹہ کا وقت دے سکتے ہیں ان کے لئے دس مہینوں پر مشتمل نصاب ڈیزائن کیا گیا ہے۔ جس میں مندرجہ ذیل علمی مواد شامل ہوگا۔

☆ مکمل قرآن با ترجمہ و تفسیر۔

☆ مجموعۂ احادیث "ریاض الصالحین" مکمل۔

☆ آسان قرآنی گرائمر۔

☆ سیرت طیبہ، مجوزہ کتب، محسن انسانیت، رحمت دارین۔

☆ وہ لوگ جو روزانہ وقت نہیں دے سکتے بلکہ ہفتہ وار چھٹی کے دن وقت دیتے ہیں ان کے لئے ایک مخصوص نصاب ڈیزائن کیا گیا ہے جس میں قرآن و حدیث اور دوسری ضروری چیزیں شامل ہوں گی۔

ہماری دعا ہے کہ حیات آباد کا یہ ادارہ پھلے پھولے اور صاحب اولاد حضرات سے میری گزارش ہے کہ اس ادارے کے روحِ رواں اور مہتمم مولانا محمد اسماعیل صاحب کی خوبصورت شخصیت کی زیارت کے لئے ایک دفعہ ضرور تشریف لائیں۔ میں تو ان کے نورانی چہرے کا معتقد اور مرید ہوں۔ آپ بھی اپنی پہلی فرصت میں تفصیلات جاننے کے لئے وہاں ایک دفعہ تشریف خود لے جائیں۔ ان شاء اللہ مسرور واپس لوٹیں گے۔

☆......☆......☆

طلبہ یونین کی بحالی، ممکنات اور خدشات

مغربی جمہوریت کے بعض پہلوؤں کے ساتھ علمی اور نظری اختلافات کے باوجود آج کے انسان کو ووٹ کے ذریعے اظہارِ رائے جیسے بنیادی حق کا ملنا، اس کا کمال ہے لیکن یہ بات بھی نظر میں رہے کہ انسانیت کو بنیادی حقوق کی تعلیم دینا اور ہر انسان کے بنیادی حقوق کو محفوظ کرنا اسلام کا معجزہ ہے۔

ہماری نئی نویلی اور طویل دعاؤں وتمناؤں کے نتیجے میں تشکیل شدہ حکومت کے ابتدائی کارناموں میں سے معزول جج صاحبان کی باعزت رہائی کے علاوہ ایک اور بڑا کارنامہ ٹریڈ یونین اور طلبہ یونین کی بحالی ہے۔ آج کی نشست میں طلبہ یونین کی بحالی کے ممکنہ فوائد اور نقصانات کے خدشات پر ایک غیر جانبدارانہ انداز میں رائے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ طلبہ وطالبات یعنی ہماری نئی نسل ہماری بقا کا تسلسل ہے۔ ان کی صحیح تعلیم وتربیت ہی ہماری ترقی وپائیداری کا ضامن ہے۔

اب جبکہ وزیر اعظم صاحب نے طلبہ یونین کی بحالی کا اعلان کیا ہے تو اس کے لئے ایک ایسا لائحۂ عمل تیار کر کے پیش کرنا چاہئے جس کی روشنی میں حکومت کا یہ فیصلہ ان مقاصد کے حصول میں ممد ومعاون ثابت ہو جو طلبہ یونین پر پابندی کی بناء پر حاصل نہیں ہو پا رہے تھے۔ بہترین صورت تو یہ ہوتی کہ حکومت طلبہ یونین کی بحالی سے پہلے نمائندہ والدین، کالجوں اور جامعات کے اساتذہ کرام اور طلبہ وطالبات کے مختلف سیکشنز کے درمیان مذاکروں، مکالموں اور بحث وتمحیص کا انتظام کیا جاتا تاکہ اس اہم فیصلہ کے سارے پہلو اور ممکنہ نتائج سامنے آجائیں۔ اس کے علاوہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر طلبہ یونین کی بحالی کے موضوع کو عوام الناس، نمائندوں اور مختلف شعبہ ہائے زندگی کے افراد کی آراء بھی شامل کرلی جائیں تو اس کی افادیت میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کے ممکنہ خدشات میں کمی واقع ہوگی۔

پاکستان میں طلبہ یونین کی تاریخ میں جہاں ایک طرف بڑے شاندار واقعات موجود ہیں تو دوسری طرف بعض ناخوشگوار واقعات بھی تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس وقت اس کا تفصیلی تجزیہ تو ممکن نہیں لیکن اجمالی طور پر اتنی بات کہی جاسکتی ہے کہ طلبہ یونین ہی کے تربیت کے طفیل پاکستان کی موجودہ سیاسی لیڈرشپ میں لیاقت بلوچ،

جاوید ہاشمی، مخدوم شاہ محمود قریشی اور اسفند یار ولی خان سرفہرست ہیں۔ان رہنماؤں کی صورت میں طلبہ یونین کی افادیت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا۔اس کے علاوہ پاکستان کے طلبہ یونین نے پاکستان میں آمریت کے خلاف جو جدوجہد کی ہے وہ سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ضیاء الحق مرحوم نے طلبہ یونین کے اسی طاقت کو محسوس کرتے ہوئے اس پر پابندی کے احکامات صادر کئے۔شاید طلبہ یونین پر پابندی کی وجہ سے بعد میں ایک دفعہ پھر پاکستان میں آمریت کا دورانیہ بہت طوالت اختیار کر گیا تھا۔اس کے علاوہ طلبہ یونین بنیادی طور پر طلبہ کی نظری سیاسی تربیت نہ کہ عملی سیاسی تربیت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔طلبہ برادری کے جائز مطالبات اور حقوق کا تحفظ بھی یونین کے بنیادی فرائض میں شامل ہے۔آج کے طلبہ یونین کے ذریعے انتخابات، جمہوری روایات، تحمل و برداشت، اور سلیقہ و نظم وضبط کے ذریعے کل کے ملکی معاملات کو سنبھالنے اور اچھے طریقے سے چلانے کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔اس لئے ہر باشعور شخص اس کی بحالی کی تائید کرے گا لیکن ساتھ ہی پاکستان میں طلبہ یونین کے ماضیٔ قریب کی تاریخ کے ساتھ چند ایسے تلخ واقعات وتجربات بھی وابستہ ہیں جن کی وجہ سے بعض اساتذۂ کرام، والدین اور طلبہ بذاتِ خود شاید اسی فیصلے کی تائید کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کریں۔کیونکہ یہ بات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں کہ پاکستان میں شاید ہمارے پڑھے لکھے طبقہ میں بھی ابھی وہ شعور مضبوط نہیں ہوسکا ہے جس کے ذریعے نظریاتی اختلاف کو نبی ﷺ کے قولِ مبارک کے مطابق اختلافِ امت کو رحمت قرار دیا گیا ہے۔ہماری عملی سیاست کی تاریخ بھی شاید بہت زیادہ شاندار نہیں۔مشرقی پاکستان کا بنگلہ دیش میں تبدیل ہونے کا سانحہ اسی عدم برداشت کی سیاست کا شاخسانہ نہیں تو اور کیا ہے؟

پاکستان میں طلبہ یونین کی تاریخ میں مختلف نظریات کے حامل گروپوں کے درمیان مسلح تصادم ابھی کل ہی کی تو بات ہے۔یونینز پر پابندی کے بعد بھی مختلف مکاتب فکر اور سیاسی جماعتوں کے طلبہ ونگز کے درمیان تعلیمی اداروں اور ہاسٹلوں میں کئی دن تک فائرنگ اور اس کے نتیجے میں قیمتی جانوں کا ضیاع ملک وملت کا ناقابل تلافی نقصان رہا ہے۔اس کے علاوہ یہ بھی ہماری بدقسمت تاریخ المیہ ہے کہ طلبہ یونین تعلیمی اداروں اور ہاسٹلوں کے انتظامات زبردستی اور ناجائز طور پر اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے اور اپنی مرضی سے ناجائز طور پر ہاسٹلوں میں رہا کرتے تھے اور اپنی ہی مرضی کے مطابق معمولی معمولی باتوں کو بڑے بڑے مسائل

(Issues) کی شکل دے کر تعلیمی ادارے بند کروا لیتے تھے جس سے ہونہار اور ذہین طلبہ، والدین اور ملک وقوم کو بھاری نقصان اٹھانا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ طلبہ یونین کے عہدیدار عموماً اپنے آپ کو ہر قسم کے قانون سے ماوراء سمجھتے ہوئے کالجوں اور جامعات کے قوانین وضوابط کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کلاسوں میں دیر سے آنا، امتحانات میں ناجائز ذرائع کا استعمال اور یونین فنڈز کا غیر متعلق کاموں پر صرف کرنا عام معمولات میں شمار ہوتا تھا۔ طلبہ یونین کی تاریخ میں بعض ایسے واقعات بھی درج ہیں کہ یونین کے رہنماؤں نے اپنے اساتذۂ کرام کی شان میں گستاخیاں بھی کی ہیں اور بعض اوقات یونین کی طاقت کے نشے میں ان کے گریبانوں میں ہاتھ ڈالنے سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔

ان سارے اموراور نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت طلبہ یونین کے لئے وفاقی اور صوبائی اسمبلی یا عدالتوں کے ذریعے ایسے قوانین کا اجراء کرے جس پر عمل درآمد کو عدالتوں کے ذریعے یقینی بنایا جاسکے۔ اس سلسلے میں ملک وقوم کے مفادات کو مدنظر رکھ کر چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

۱۔ جس طرح آئین پاکستان کے شق نمبر ۶۲، ۶۳ کے مطابق قومی یا صوبائی اسمبلی کے امیدوار کے لئے ایک ضابطۂ اخلاق بیان ہوا ہے اسی طرح طلبہ یونین کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے بھی ایک اخلاقی اصول وضابطہ مقرر کرنا چاہئے۔ اخلاقی اصولوں کے ساتھ ساتھ علمی صلاحیت وقابلیت کا بھی کوئی لحاظ اور معیار رکھا جائے تو بہت اچھے نتائج کی توقع کی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی والدین سے اجازت کی شرط بھی اگر ضروری قرار دی جائے تو بہتر رہے گا۔

۲۔ طلبہ کے منتخب رہنماؤں کو قانون کے ذریعے پابند بنایا جائے کہ وہ سیاسی جماعت کے کسی رہنما کو تعلیمی اداروں میں مہمان خصوصی یا مقرر کی حیثیت سے نہیں لائے گا کیونکہ اس کے ردعمل میں دیگر گروپوں کے طلبہ اپنے پروگراموں میں اپنے اپنے رہنما لانے کی خواہش کریں گے۔ اس کے نتیجے میں رہنماؤں کے مختلف نظریات کی وجہ سے طلبہ برادری کے درمیان نظریاتی خلیج کے وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں کا سیاسی اکھاڑا بننے کے امکانات بھی زیادہ ہوں گے۔ اس لئے اگر سیاسی جماعتوں کے رہنما بھی ازخود اپنی قومی ذمہ داریوں کے تحت اس میں احتیاط برتیں تو قوم وملک اور معاشرہ پر اس کے خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے۔

۳۔ تاریخ کے اس نازک موڑ پر اگر وطن عزیز کے معزز سیاستدان اور مذہبی رہنما بھی آپس میں غیر تحریری طور

پر یہ عہد کرلیں کہ ہم اپنے بچوں کو اور ملک وقوم کے مستقبل کو اپنے سیاسی نظریات کی ترویج اور کچھ سیاسی مفادات کے حصول کے لئے کبھی بھی ناجائز طور پر استعمال نہیں کریں گے اور نہ ہی طلبہ رہنما کی ناجائز سرپرستی کریں گے تو میرے خیال میں اس کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔

وطنِ عزیز میں جاری نازک صورتحال کے پیشِ نظر معاشرے کے ہر فرد کا فرض بنتا ہے کہ حکومت کے ہر اچھے حکم کی اطاعت کرے اور قوم کے سارے افراد بالخصوص طلبہ وطالبات پاکستان کو درپیش بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے میں حکومت وقت کا ہاتھ بٹائیں اور اپنی صلاحیتوں کو اپنے اپنے مقام پر ملک وقوم کی ترقی کے لئے بروئے کار لائیں۔

اس اہم موقع پر وطنِ عزیز کے سارے تعلیمی اداروں کے طلبہ وطالبات سے یہی درخواست اور توقع ہے کہ بڑے عرصے بعد وجود پذیر جمہوری حکومت کے اس نیک اور اہم اقدام کو درست ثابت کرنے کے لئے ہمیشہ اس بات کو مدنظر رکھیں کہ اول وآخر ہم مسلمان بھائی ہیں اور پاکستانی بھائی ہیں۔ بھائیوں اور بہنوں کے مفادات اور نقصانات سانجھے ہوتے ہیں۔

United we stand, divided we fall.

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک

☆......☆......☆